جھارکھنڈ کے جدید غزل گو شعراء کا

تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

حسن نظامی

جھار کھنڈ کے جدید غزل گو شعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

حسن نظامیؔ

جھارکھنڈ کے جدید غزل گو شعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

حسن نظامی

نام کتاب : جھارکھنڈ کے جدید غزل گوشعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

مصنف : حسن نظامی

اشاعت : ۲۰۰۷ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : ۲۰۰روپے

کمپوزنگ : پرنٹ ہٹ، واسع پور، بھولی روڈ، دھنباد (جھارکھنڈ)

مصنف کا پتہ : شمشیر نگر، جھریا، دھنباد، پن کوڈ:۸۲۸۱۱۱

(جھارکھنڈ)

ملنے کے پتے : حسن نظامی، شمشیر نگر، جھریا، دھنباد، پن کوڈ:۸۲۸۱۱۱

آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور۔۸۳۱۰۰۱

انتساب

قابلِ احترام

اور

اپنی بہن

عقیلہ بانو (مرحومہ)

کے نام

تعارف

نام	:	محمد حسن نظامی
قلمی نام	:	حسنؔ نظامی
والدین	:	محمد شمس الدین رعائشہ خاتون
تاریخ پیدائش	:	۱۹راگست ۱۹۶۷ء
جائے پیدائش	:	شمشیر نگر، جھریا، دھنباد
تعلیم	:	ایم۔اے، بی ٹی، پی ایچ ڈی (جاری)
		نیٹ رسلیٹ کوالیفائڈ
شغل	:	درس وتدریس
اہلیہ	:	بشریٰ نظامی
اولادیں	:	کاشف نظامی رزرتاب نظامی
پتہ	:	شمشیر نگر، جھریا، دھنباد

فہرست

۱. پس عرض ہنر ۱

۲. حروف ہنر ۳

۳. صورت گر ۶

۴. صدیق مجیبی ۷

۵. ظہیر غازی پوری ۱۵

۶. پرکاش فکری ۲۴

۷. منظر شہاب ۳۵

۸. سید احمد شمیم ۴۰

۹. رونق شہری ۵۳

۱۰. وہاب دانش ۶۳

۱۱. اسلم بدر ۶۹

۱۲. شان بھارتی ۷۷

۱۳. نجم عثمانی ۸۵

۱۴. آمر صدیقی ۹۵

۱۵. نادم بلخی ۱۰۳

۱۶. راشد انور راشد ۱۱۰

۱۷. شائق مظفر پوری ۱۱۷

۱۸. سرور ساجد ۱۲۳

۱۹. خورشید طلب ۱۲۹

۲۰. شمس فریدی ۱۳۵

۲۱. انوری بیگم ۱۳۷

۲۲. محبوب اکیلا ۱۴۳

۲۳. حفیظ بیتاب ۱۴۵

۲۴. احمد بدر ۱۴۹

۲۵. جمیل مظہر ۱۵۳

۲۶. معین الدین شمسی ۱۵۹

۲۷. میں اور میری شاعری ۱۶۱

۲۸. آوازِ اضافی ۱۶۳

- شمیم ہاشمی • بدر عالم خلش • پرویز رحمانی
- عقیل گیاوی • مصطفٰے مومن • سہیل فصیحی
- نسیم اختر نسیم • انور شمیم • نازاں جمشید پوری
- شاداں منیری • مہتاب انور • افسر کاظمی
- امتیاز عزیز • ڈاکٹر قمر الزماں • غیاث انجم
- مشتاق احزن • احسن امام احسن • احمد نثار
- حسن رضا اطہر • امتیاز دانش • احمد فرمان
- فرحت حسین خوشدل • حبیب عادل

پس عرضِ ہنر

اردو زبان وادب میں تلاش وتحقیق کی کافی پرانی روایت ہے۔ تحقیق کے باب میں مشاہیر اس نکتے پر زور دیتے رہے ہیں کہ ادب میں کوئی بھی موضوع نیا یا پرانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ماخذات کے ڈھیر میں کون سی ایسی ادھ جلی چنگاری ہوائے وقت کی زد میں آکر بجھ گئی تھی جسے روشن کرنے کی از سر نو ضرورت ہے۔ جھارکھنڈ ایک ایسی نو تشکیل شدہ ریاست ہے جسکی اپنی جغرافیائی، لسانی تہذیب ہے۔ کھورٹھا، منڈاری کے علاوہ ہندی اور اردو زبان وادب کی بھی تخلیقات وافر مقدار میں موجود ہیں۔ غیر منقسم بہار سے پہلے جھارکھنڈ کے بیشتر اضلاع میں اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنا منصب حاصل کر چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے پڑھنے والوں کی ایک کثیر تعداد یہاں موجود ہے۔ ادب کے مختلف اصناف میں صنف شعر سے تعلق رکھنے والوں کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد موجود ہے۔ میں خود ایک شاعر ہوں اور جھارکھنڈ کے معتد بہ شعراء کی تخلیقات پر میری نظر ہے۔ ایسے شعراء بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں جن کی شناخت ملک گیر ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی ہے۔ ایسے شعراء بھی مجھے متاثر کرتے رہے ہیں جن کے اشعار اکابر ادب کی تحقیقی تنقیدی کتابوں میں بطور حوالہ پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اس سے قبل ان شعراء کی شاعری کی قدر و قیمت کا احتساب نہ کیا گیا ہو۔ ان میں بعض ایسے شعراء بھی ہیں جن پر کئی اہم رسالوں نے خصوصی گوشے شائع کئے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جھارکھنڈ کے مقتدر ادباء شعراء کی غزلیہ شاعری پر اب تک کوئی ایسی ٹھوس اور جامع کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے جسے تنقید و تجزیے کی میزان پر تولا جا سکے۔ اس لئے میں نے یہ محسوس کیا کہ ایک ایسی کتاب تحریر کی جائے جو جھارکھنڈ کی غزلیہ شاعری پر نقد و نظر کے معیار پر کھری اتر سکے۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کروں گا کہ اسطرح کی پیشکش میں سو فیصد کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اپنی غرض

وغایت کی پاکیزگی پر حرف لانے کا موقع بھی فراہم نہیں کرسکتا کہ جن اہم شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ سرسری نہیں ہو کر باتفصیل مطالعے کا موضوع بن گئی ہے۔ وقت بے رحم اور سفاک ہے۔ آج جو قدر رائج الوقت سکّے کی طرح جاری ہے وہ آنے والی صدی میں مردود قرار دی جاسکتی ہے۔ دستاویزی حیثیت حاصل ہونے کا گمان قبل از وقت کرنا خلاف دانشمندی ہے تاہم میں ارباب فکر ونظر سے یہی استدعا کروں گا کہ اس تنقیدی و تجزیاتی کتاب کا مطالعہ عصری حقائق کے تناظر میں کریں تو میری محنت کے رائیگاں ہونے کا خدشہ جاتا رہے گا۔

میں اخیر میں عزت مآب سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ش۔ اختر صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے میری اس کاوش پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کر میری حوصلہ افزائی کی۔ میں محترم غلام مرتضیٰ راہی قابل افتخار رونق شہری، زین رامش اور سرور ساجد صاحبان کا بھی شکر گزار ہوں کہ میری اس تنقیدی و تجزیاتی کتاب کے مسودے کو بہ نظر استحسان دیکھا اور میری رہنمائی فرمائی۔ اس کتاب کی اشاعت میں والدین کی دعاؤں اور شریک حیات بشریٰ نظامی کی نیک تمناؤں کا کافی دخل ہے۔ میں ان کی قربانیوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں احسان مند ہوں جناب پروفیسر سید منظر امام، احمد نثار، حفیظ بیتاب، گلزار خلیل، قمر عالم، شمشیر علی، وکیل ارشد، نوشاد عالم، شکیل اقبال، جسیم الدین، مختار خاں، خورشید انور، شاہد انور، شریف رضا، راشد نور، شمیم قریشی و دیگر احباب کا جنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے میری دشواریوں کو آسان کیا۔

میں جناب علی حسن صاحب کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ میں اس کتاب کے تئیں تحریک پیدا کی اور حوصلہ بخشا۔

حروف ہُنر

جھارکھنڈ کی ادبی وتہذیبی روایت کی تاریخ تقریباً ساڑھے تین سو سال پرانی ہے۔اس سے زیادہ قدیم اس علاقے کی اردو زبان کی تاریخ ہے لیکن باعث افسوس ہے کہ اس علاقے کی کوئی ادبی وتہذیبی تاریخ اب تک لکھی نہیں گئی ہے ہمارے ریسرچ اسکالرس، اساتذہ کرام اور مقامی فنکاروں نے تحقیق اور تنقید کی کچھ منزلیں طے کی ہیں۔شعبۂ اردو کے بعض اساتذہ کرام نے اپنی نگرانی میں جھارکھنڈ کی ادبی اورلسانی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے لیکن پھر بھی کسی ایسی مبسوط تصنیف کا پتہ نہیں چلتا جو تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے مکمل اور منفرد ہو۔اردو افسانے سے اردو غزل تک کئی تحقیقی مقالے تیار ہوئے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس علاقے کے منفرد فنکاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے۔ زیر نظر تصنیف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب جھارکھنڈ کے ان جدید غزل گو شعراء سے تعلق رکھتی ہے جنھوں نے غزل کی روایت کی توسیع کی اور زندگی کے نئے تقاضوں کا احساس کرایا۔

جدید شاعری کی مختلف شاخیں ہیں ایک وہ شاخ ہے جسے میں جدید ترقی پسندی سے تعبیر کرتا ہوں۔دوسری وہ جو ترقی پسندی کی روایت سے بغاوت کے طور پر سامنے آئی اور فکرو نظر کے ساتھ ساتھ جس نے اپنی ایک نئی ڈکشن بھی بنائی۔ یہ ایک فطری تخلیقی عمل تھا۔اس عمل میں نئے حالات کی مجبوریاں زندگی کو نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش اور لفظ و معنی کی

نئی دنیا چھپی تھی۔ میں شعروادب میں ہر تجربے کا خیر مقدم کرتا ہوں خواہ وہ کامیاب تجربہ ہو یا ناکام۔ کیونکہ اگر تجرید نہ ہو تو جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جمود زندگی میں ہو یا ادب میں زوال کی علامت بن جاتا ہے۔نئی شاعری خاص طور پر غزل کی نئی شاعری لفظ و معنی کے نئے لباس میں ہماری توجہ کھینچتی ہے۔اور ادب کے سنجیدہ قارئین کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے۔ جھارکھنڈ کے جدید غزل گو شعراء ان حقائق سے آشنا ہیں۔ یہ آشنائی انھیں تخلیقی تجربوں کی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔نئی رہ گذر سے ہمیں واقف کراتی ہے اور احساس و تجربات کی ایک نئی دنیا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جھارکھنڈ کے نئے غزل گو شعراء بڑے شعراء ہیں لیکن ان میں کئی شعراء ایسے ضرور ہیں جن کے ذکر اور جن کے مطالعے کے بغیر غزل کی کوئی تاریخ مکمل اور معتبر نہیں ہو سکتی۔ پرکاش فکری، وہاب دانش، منظر شہاب، سید احمد شمیم صدیق مجیبی، سرور ساجد، رونق شہری وغیرہ ایسے شعراء یقینی ہیں جن کی غزلیں روایت کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اور روایت سے ہٹ کر نئے اسلوب کی مالک بھی ہیں۔ یہ شعراء نہ صرف اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں بلکہ ان کی تخلیقات ہمیں اچھے اور معیاری ادب سے آشنا کراتی ہیں۔ ممکن ہے حسن نظامی صاحب کی فہرست میں کئی اور نام شامل ہوں کیونکہ کوئی تاریخ اپنی جگہ مکمل نہیں ہوتی۔ ہر لمحہ اس میں اضافے اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہماری فکر و نظر جیسے جیسے نئے حقائق سے آشنا ہوتی ہیں ویسے ویسے شعروادب میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ حسن نظامی صاحب کی یہ کتاب یقینی طور پر اس سلسلے کی ایک اہم کوشش ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ جب جھارکھنڈ کی

ایک مکمل اور مبسوط ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہو جائے گا جس طرح ڈاکٹر مقبول احمد کی کتاب ''جھار کھنڈ میں اردو غزل'' کا مطالعہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کے لئے عام مواد فراہم کرتی ہے۔ حسن نظامی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جھار کھنڈ کے جدید غزل گو شعراء پر تحقیق کی اور اپنے مضامین کے ذریعے ان شعرائے کرام کا تنقید و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔

ڈاکٹر ش۔ اختر
سابق وائس چانسلر
رانچی یونیورسٹی جھارکھنڈ

صورت گر

صدیق مجیبی — ظہیر غازی پوری — پرکاش فکری — منظر شہاب — سید احمد شمیم

رونق شہری — وہاب دانش — اسلم بدر — شان بھارتی — نجم عثمانی

آمر صدیقی — نادم بلخی — راشد انور راشد — شائق مظفرپوری — سرور ساجد

خورشید طلب — شمس فریدی — انوری بیگم — محبوب اکیلا — حفیظ بیتاب

احمد بدر — جمیل مظہر — معین الدین شمسی
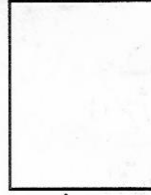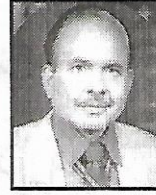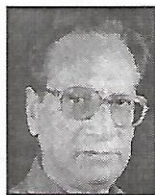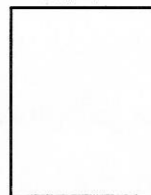
صدیق مجیبی

نام	:	صدیق احمد گدی
قلمی نام	:	صدیق مجیبی
تاریخ پیدائش	:	۱۹۳۱ء
جائے پیدائش	:	ڈورنڈہ، رانچی۔۲
والد	:	محمد مجیب گدی
تعلیم	:	ایم۔اے، پی۔ایچ ڈی، چھوٹا ناگپور میں اردو زبان و ادب کا ارتقا
مشغلہ	:	شعروشاعری
تصانیف	:	شجر ممنوعہ (شعری مجموعہ)
اعزازات	:	وائس چیرٔمین، اردو اکیڈمی، بہار
پتہ	:	سنٹرل اسٹریٹ، ہند پیڑی، رانچی۔۱

صدیق مجیبی

جھارکھنڈ ایک نوتشکیل شدہ ریاست ہے تہذیبی اور ثقافتی سطح پر اس وقت بھی اس کی ایک الگ پہچان تھی جب وہ بہار کا ایک حصّہ تھا اردو شعروادب کے حوالے سے شہر عظیم آباد میں اہلِ جھارکھنڈ کی گونج شروع سے سنائی دیتی رہی ہے ادب کا میدان بھی اس سے خالی نہیں رہا ہے۔صنف نثر میں جہاں غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی نے اپنی تخلیقات سے گہرے نقوش چھوڑے ہیں منظومات میں خصوصاً غزل کے باب میں کئی ایک ایسے شعراء بھی سامنے آتے ہیں جنکی مخصوص پہچان غزل کے وسیلے سے ہوتی رہی ہے۔میری مراد جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی کے ان تین شعراء سے ہے جنکی ترتیب درست کرنے کے پہلے کافی غوروخوض کی ضرورت ہے۔ پرکاش فکری، صدیق مجیبی اور وہاب دانش رانچی کے احباب ثلاثہ رہے ہیں لیکن غزلوں میں ان کا رنگ وآہنگ مختلف رہا ہے ان کا تقابل چونکہ ہم عصر ہونے کی حد تک ہے اس لئے تخلیقات کے اعتبار سے تقابلی مطالعہ مقصود نہیں ہے۔ بہت پہلے صدیق مجیبی کو کسی ناقد نے اردو غزل کی آبرو کہا تھا اس کے پیچھے کوئی بھی جواز پوشیدہ ہو لیکن اتنا طے ہے کہ صدیق مجیبی محافظِ فکروفن بن کر اپنی بھرپور تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔صدیق مجیبی کبھی کثیرالاشاعت نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ ناموری اور شہرت میں ان کے بعض معاصرین بہت آگے ہیں۔صدیق مجیبی کو جولوگ قریب سے جانتے ہیں وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ غزل میں فکر کی تازگی، انداز پیشکش اور صوتی خوش آہنگی برتتے ہوئے صدیق مجیبی اپنے ہونے کا جواز کس طرح فراہم کرتے ہیں۔نئی شاعری جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا ایک نامکمل سلسلہ ہے اس میں صدیق مجیبی کی شاعری قاعدے سے پڑھی اور سمجھی جاسکتی ہے۔صدیق مجیبی کی شاعری داخل سے خارج تک کا سفر طے کرتی ہے اس لحاظ سے انہیں جدید اسلوب وآہنگ کا شاعر قرار دیا جاسکتا ہے۔ غزلوں کے تفصیلی مطالعے سے یہ نکتہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ حسبِ ضرورت ان کی فکری مراجعت بھی ہوتی ہے یعنی خارج سے داخل کی طرف کا سفر بھی سلیقے سے طے کیا ہے اس ضمن میں دونوں طرح کی کیفیات سے مملو اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جیسے

اکیلے پن کا ایک دوزخ لیئے پھرتا ہوں سینے میں
ذرا بھیگی میری آواز اور شعلہ نکل آیا
بونوں نے اس کے توڑ لئے سارے میٹھے پھل
میں شاخِ باردار جھکانے میں رہ گیا

محولہ دونوں اشعار صدیق مجیبی کے فکری رجحان اور اڑان کے مثبت و منفی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں ایک طرف جہاں ذات سے منسوب تہہ داری اور رمزیت ہے تو دوسری طرف معاملات زندگی کے خارجی عناصر سے متصادم صورتِ حال کا آئینہ دکھائی دیتا ہے یہ طے شدہ امر ہے کہ دونوں صورتوں میں شاعر کی بالغ نظری روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ صدیق مجیبی نے مشہور ہونے کے لیئے وہ حربے استعمال نہیں کیئے جو آج کی نسل یا پیش رووں میں بھی کچھ لوگوں نے اختیار کرر کھے تھے۔ احساس کی سطح پر صدیق مجیبی کا فن سونا کی طرح چمکتا ہے۔ اس سونے میں کہیں کوئی ملاوٹ نہیں ہے تاریخی حوالے بیانات کی شکل میں جب آنے لگے تب اردو غزل کا زوال شروع ہونے لگتا ہے صدیق مجیبی اس معاملے میں کافی محتاط رہے ہیں۔ ذہن پر تلمیحات کا بوجھ رکھکر مدتوں گم سم رہنے والا شاعر صدیق مجیبی سے توقع بھی یہی کی جا سکتی تھی کہ وہ اس قبیل کے اشعار معرض وجود میں لائے گا۔

تمہاری مرجانہ سیاست یقیں کا چہرہ جھلس چکی ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پہ امتیازی نشان مت دو

صدیق مجیبی کا کلام گاہ بہ گاہ رسائل کی زینت بنتا رہتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کا شعری مجموعہ شائع ہونے کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جس کے یہ مستحق ہیں۔ ''شجر ممنوعہ'' ان کا پہلا شعری مجموعہ جو جابر حسین کی وساطت سے شائع ہوا تھا ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ ہی نہیں سکا جو غزل کے مہار تھی اور پارکھ رہے ہیں یہ صدیق مجیبی کی بڑی ٹریجڈی ہے کہ اتنی دم خم بھری شاعری کو عوام کیا خواص تک بھی پہنچانے میں ناکام رہے اس سے ادب کا ایک مخصوص طبقہ اچھی شاعری کی لذت سے محروم رہ گیا یہ نقصان صرف صدیق مجیبی کا نہیں بلکہ اردو ادب کا ہے۔

صدیق مجیبی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ ابہام و اہمال سے پاک رہے ہیں۔ مطالعہ یہی بتاتا ہے کہ چھٹے دہے میں شمس الرحمٰن فاروقی کے رسالے ''شب خون'' نے جس نوعیت کی غزلوں کو فروغ دیا تھا اس کا ایک مخصوص حلقہ بھی پیدا ہو گیا تھا، جس طرح افسانے میں

کل کی جگہ جز اور غزل میں لایعنیت نے اپنے پاؤں پسار لیئے تھے۔ اس سے اردو شعروادب کا ایک دوسرا حلقہ کافی نالاں بھی ہو گیا تھا۔ صدیق مجیبی شروع سے ہی ان مکردہات سے پرہیز کرنے کی شعوری کوشش کر رکھی تھی یہی وجہ ہے کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے کی ان کی غزلوں میں ترسیل کی ناکامی کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ وہ اُس زمانے میں بھی کیفیت کے شاعر تھے اور آج بھی ہیں ان کے کلام میں ارضیت پسندی شروع سے ہی موجود رہی ہے وہ ان کی ذات کا معاملہ ہو یا ذات سے باہر خارجی عوامل کا ہر جگہ ان کی مخصوص شعری کیفیت دکھائی دیتی ہے۔

جگنو سے آگ لگانے والے اس البیلے شاعر کا طرّہ امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ لفظوں کے تلذّذ کا شکار کبھی نہیں ہوتے۔ معاملہ ایسا ہے کہ لوگ آواز کی لذّت میں گرفتار ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ ایسی سحر کاری سے سماعت ہی نہیں ذہن بھی تازہ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ الفاظ کی مناسب قرأت ہی آواز ہے اس لیئے اس طرح کی لذت کوشی کو دانستہ شعر میں فروغ دینا مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا اچھے خاصے شعراء تنہائی، فردیت، خموشی، ویرانی، اجنبیت، شکستگی، انتشار جیسے موضوعات کو برت کر غزلیہ شاعری میں شعوری طور پر حزنیہ رنگ پیش کر رہے تھے لیکن ان کی یہ کوشش گونج بننے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی تھی۔ ایسے امتحانی وقت میں بھی صدیق مجیبی نے فیشن زدگی سے نہ صرف خود کو بچائے رکھا بلکہ آنے والی نسل کیلیئے بھی ایک سمت کا تعین کرنے میں معاونت کی میری مراد صدیق مجیبی کے اس ذہنی رویّے سے ہے جہاں لفظ ان کے دست ہنر میں آکر گہری معنویت سے گہر آبدار بن جاتا ہے۔

اے شہر ستم پیشہ کر ہاتھ قلم میرا
دیکھے نہیں جاتے ہیں پھلدار شجر مجھ سے

صدیق مجیبی کی نجی زندگی غم واندوہ سے بھری پڑی ہے۔ عالم جوانی میں رفیق حیات کا ساتھ چھوڑ جانا مصیبت کی انتہا ہے۔ صدیق مجیبی کا المیہ مختلف اشعار میں جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شریک حیات کی جدائی کی سنگینی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نوع کے اشعار ان کے قلم سے ظہور پزیر ہوئے ہیں۔

اکیلے پن کا اک دوزخ لیئے پھرتا ہوں سینے میں
ذرا بھیگی مری آواز اور شعلہ نکل آیا

صدیق مجیبی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف ان کا بولتا ہوا شعری آہنگ ہے۔ ہزاروں شعراء کی غزلوں کے درمیان اگر مجیبی کا ایک شعر بھی بغیر نام ڈالے پوچھا جائے گا تو اشارہ اسی شخص کے نام ہوگا۔ اردو کی غزلیہ شاعری اس طرح کی شاعری سے بھری پڑی ہے کہ معیار و مقدار ہمیشہ ایک دوسرے کی صفاتِ ضدین بن کر سامنے آئے ہیں۔ شعری مجموعوں کا ڈھیر لگانے والے، فہرست سازی کرنے والے معیار تخلیق کی پرواہ کرہی نہیں سکتے۔ صدیق مجیبی کا اب تک ایک ہی شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے اور ٹریجڈی یہ ہے کہ قاعدے سے یہ ان ہاتھوں تک بھی نہیں پہنچ پایا جو ہمعصر غزل کے جویا ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ رونق شہری کے پاس بھی نہیں ہے جو صدیق مجیبی کے مُحب خاص رہے ہیں۔ ادھر ایک سہ ماہی نے ان پر گوشہ شائع کرا کر ہم پر احسان عظیم کیا ہے کہ ان کے اشعار کی یکمشت رسائی ہو سکی۔ بات مقدار و معیار کی تھی اس نوع سے صدیق مجیبی کے متعلق بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نگاہ کلام کے معیار پر ہمیشہ رکھی ہے۔ یہ اپنے آپ میں قابل توجہ بات ہے کہ کوئی شاعر مسلسل اپنے فکر و فن کا محاسبہ کرتا رہے اور شعر کہتا رہے۔ معیار کے سلسلے میں ایک بات اور عرض کرنی ہے وہ۔ یہ کہ معیار تبھی قائم رہ سکتا ہے جب اس کے یہاں دہرانے کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔ ورنہ محض چند لفظوں کے ہیر پھیر سے ساری عمر اچھے اچھے شاعر ایک ہی بات کو متواتر لکھتے رہے ہیں۔ فن کی چاشنی، فکر کی اُڑان، الفاظ کی بندش، تراکیب، تشبیہہ و استعارہ اور پھر اپنی ذات سے ہم آہنگی یہ ساری چیزیں عمدہ شاعری کی تخلیق کا جواز ہوا کرتی ہیں۔ صدیق مجیبی اس کسوٹی پر سو فیصد سچے ثابت ہوتے ہیں۔ درج ذیل اشعار سامان ذوق کی فراہمی کے بہترین مظاہر بن کر سامنے آتے ہیں۔

یارب ہوائے وقت سے دستار کیا گری
اک ناتراش بھی مجھے تو بولنے لگا

دشت سراب وسنگ میں سایہ نہ کر تلاش
فکر نجات حوصلہء رائیگاں ہے چل

کشتیاں ریت پہ بیٹھی ہیں امیدیں باندھیں
ایسا لگتا ہے یہ صحرا کبھی دریا ہوگا

کہیں کہسار میں پتھر کا سینہ شق ہوا ہوگا
کہ جنگل سن رہا ہے دیر سے تقریر پانی کی

یہ کیسی دھند ہے رخت سفر پہ چھائی ہوئی
نہ ختم ہوتا ہے رستہ نہ گھر نکلتا ہے
پازیب باندھتی ہے قیامت جھکی ہوئی
دیکھ اے فلک یہ تیری دھنک کا جواب ہے
جسم کے رشتے ہیں سچے روح کے قصے فضول
اب کے وہ بچھڑا تو پھر دل سے بھلا دے گا مجھے

صدیق مجیبی کی شاعری کی مختلف جہات پر مختلف ناقدین نے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی صدیق مجیبی کی غزل گوئی کے مدّاح رہے ہیں انھوں نے رانچی کے تین اہم شعرا صدیق مجیبی، پرکاش فکری اور وہاب دانش کو مشاق شعرا کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے بلکہ پرکاش فکری اور صدیق مجیبی سے اپنی قربت کا بھی خلاصہ کیا ہے خصوصاً صدیق مجیبی کو Trival Culture کی دین کہا ہے صدیق مجیبی کے یہاں جنگل بیاباں، کچے پکے پھلوں کی خوشبو، درختوں کا سلسلہ مخصوص پس منظر میں تلاش کرتے ہوئے ان کی ذہنی وابستگی کو ظاہر کیا ہے لیکن شاعرِ مذکور کے بارے میں چھوٹا ناگپور کی جنگلی تہذیب کا کوئی ایسا برملا اظہار صدیق مجیبی کی شاعری میں نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تیزی سے مٹتے ہوئے جنگلات اور شہر کی طرف بڑھتے ہوئے گاؤں اور اس سے پیدا شدہ خلط ملط ہوتی ہوئی صورت حال کا اشاریہ صدیق مجیبی کی شاعری میں ضرور ملتا ہے مثال کے طور پر یہ شعر

یہ کس حصار میں سانسوں نے کس دیا ہے مجھے
یہ کیسا گھر ہے نکلنے کا راستہ بھی نہیں
یہ کیسا دُکھ ہے جو روتا ہے سسکیاں لے کر
کھنڈر میں کون ہے روپوش بولتا بھی نہیں
یہ کیسا شہر ہے کیسی ہے سر زمیں اسکی
جہاں کی خاک پلٹتا ہوں سر نکلتا ہے

ان اشعار کے مزاج پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ صدیق مجیبی کے یہاں بیک وقت طبیعت کے

دو متوازی دھارے بہتے نظر آتے ہیں ایک طرف اپنی ذات کی گمشدگی یا موجودگی کا احساس تو دوسری طرف ارضیت پسندی کے پیش نظر گاؤں شہر جنگل کی خارجی فضا دکھائی دیتی ہے صدیق مجیبی کی فکر کا طائر متصادم صورت حال سے نبرد آزما رہتا ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں داخلیت خود شاعر کی قلبی واردات کا منظر نامہ بن کر سامنے آتی ہے وہیں زمان و مکان کے درد و غم کو سمیٹنے میں شعری کائنات کی پوری وسعت آنکھوں کے سامنے ٹھہرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ صدیق مجیبی کے یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اپنے معاصرین کے برعکس رنج و غم کی ایک ایسی مضمحل فضا دیکھنے کو ملتی ہے جو صدیق مجیبی کے ذاتی تجربے سے عبارت ہے مثال کے طور پر

نیند آتی ہے تو اک خوف سا لگتا ہے مجھے
جیسے ایک لاش پر ہو چیل اترنے والی
ڈرتا ہوں کہ یہ دن کا لڑھکتا ہوا پتھر
اس غار کا منہ بند نہ کر دے میں جہاں ہوں

نیند آتی ہے بہت رات گئے
صبح دروازہ صبا کھولتی ہے

ان اشعار کی تہہ میں اتر کر نئے جہان معنی کے سیر کرنے کی طبیعت چاہتی ہے محولہ اشعار کی قراءت اور تصور کا پس منظر دونوں اگر ایک سدھ میں ہوں تو صدیق مجیبی کے بہتر اشعار کی شان نزول ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ نیند کے نہیں آنے سے خوف سا لگنا، لاش پہ چیل اترنے کا گمان ہونا، دن کو لڑھکتا ہوا پتھر کہنا کچھ ایسے تخلیقی تلازمے ہیں جو صدیق مجیبی کی اپنی شناخت کو قائم کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں تشبیہہ و استعارات کا خزانہ بھرا پڑا ہے زیادہ تر معاملات میں مبالغہ آمیزی نے حقیقی صورت حال کو ڈھک لیا ہے یہ شاعر کی بالغ نظری پر دلالت کرتی ہے کہ شعر کی کائنات کہاں تک منوّر ہو سکتی ہے۔ صدیق مجیبی ایسے شاعر ہیں جنہیں یہ خدشہ ستاتا رہتا ہے کہ جگنو سے بھی آگ لگ سکتی ہے آج کے عہد کا المیہ بھی یہی ہے کہ بے تعلق بھیڑ سے تصادم کا خوف ہر گام قائم رہتا ہے۔ صدیق مجیبی کی شاعری کے کئی روشن پہلو ہیں۔ ان میں کوئی ایک مخصوص لفظ کا بار بار مستعمل ہونا بھی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان الفاظ کو مختلف مراحل طے کرنے میں شاعر کی ذہنی کیفیت سے سب سے پہلے اجازت لینی

پڑتی ہے مثال کے طور پر

ایک اداسی مری دہلیز پر بیٹھی ہو گی
ایک جگنو مرے کمرے میں بھٹکتا ہوگا

صدیق مجیبی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف جمالیاتی حس بھی ہے یہ حس ان کے مخصوص انداز نظر کو جاوداں کرتی ہے تو دوسری طرف قارئین، سامعین کو دعوتِ غور و فکر بھی دیتی ہے مثال کے طور پر

پازیب باندھتی ہے قیامت جھکی ہوئی
دیکھ اے فلک یہ تیری دھنک کا جواب ہے
عجیب عالم میں ہم بہم تھے بدن لہو کے سرور میں تھا
نہ رات اپنی سیاہیوں میں نہ دن اجالوں کے نور میں تھا
شفق کہ گلنار ہوچکی تھی، فضا سر شار ہو چکی تھی
نگاہ دل کا لطیف نغمہ سکوت لب کے ظہور میں تھا
دھنک کے جھولے میں دل کا موسم وصال کے گیت بن رہا تھا
مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی قریب تھا میں کہ دور میں تھا

صدیق مجیبی کی غزل کی ایک روشن جہت انانیت پسندی بھی ہے۔ میری سمجھ سے انکے انا گیر ہونے میں اس صورت حال کا بھی دخل ہے جو ان کی طبیعت کے بر خلاف ہے۔ مجیبی کی طبیعت کی سرکشی اسوقت بہت بھلی معلوم ہوتی ہے جب احتساب واضطراب کی ملی جلی کیفیت اشعار میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر

سونپ دوں کس کو میں دستار فضیلت اپنی
آپڑی اس کو مرے سر کی ضرورت اب کے
گر تجھ سے سنبھل پائے گراں بار امانت
لے جا میرے سر سے مری دستار بھی لے جا
اپنا سر کاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا

ظہیرؔ غازی پوری

قلمی نام	:ظہیرؔ غازی پوری
خاندانی نام	:الحاج ظہیر عالم انصاری
تاریخ ولادت	:۸/جون ۱۹۳۸ء
والد	:الحاج عبدالحیٔ انصاری
وطن	:غازی پور (یوپی)
وطن ثانی	:ہزاری باغ (جھارکھنڈ)
مشغلہ	:آفس سپرنٹنڈنٹ (ریٹائرڈ)
تلمذ	:سحابِ سخن علامہ ابر احسنی (وابستگی ۱۹۵۵ء)
خصوصی نمبر	:''اسباق'' (پونہ) ''معلم اردو'' لکھنؤ اور ''نوائے ڈگر'' (جموں) نے خصوصی نمبر شائع کئے
ادبی گوشے	:سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی نے ۷۶ صفحات پر مشتمل گوشہ اور ''سالار'' (بنگلور) نے دو ادبی صفحات پر مشتمل گوشہ شائع کیا۔
تحقیقی کام	:(۱) ڈاکٹر انور مینائی۔ کولار (کرناٹک) نے تحقیقی مقالہ لکھا۔ موضوع تھا ''جدیدیت کا تنقیدی مطالعہ ظہیرؔ غازی پوری کے مخصوص حوالے سے'' (۲) ڈاکٹر منہاج مجروح۔ ہزاری باغ نے تحقیقی مقالہ قلمبند کیا۔ موضوع تھا ''ظہیرؔ غازی بحیثیت نقاد اور شاعر''

مستقل پتہ :ہاشمیہ کالونی، ہزاری باغ، (جھارکھنڈ)

تصنیفات مطبوعہ

۱۔ ''تثلیثِ فن'' ۔۱۹۷۲ء۔ نظمیں (مشترکہ مجموعہ)

۲۔ ''الفاظ کا سفر'' ۔۱۹۷۶ء غزلیں/نظمیں

۳۔ ''آشوبِ نوا'' ۔۱۹۷۸ء غزلیں

۴۔ ''کہرے کی دھول'' ۔۱۹۸۶ء نظمیں

۵۔ ''سبز موسم کی صدا'' ۱۹۹۰ء غزلیں

۶۔ ''دعوت صد نشتر'' ۔۱۹۹۷ء رباعیات

۷۔ ''لفظوں کے پرند'' ۔۱۹۹۸ء نظمیں

۸۔ ''مطالعہ اقبال کے بعض اہم پہلو'' ۲۰۰۳ء۔تنقید و تحقیق

۹۔ ''اردو دوہے.... ایک تنقیدی جائزہ'' ۲۰۰۵ء۔تنقید و تحقیق

ترجمہ

۱۰۔ ''کیسے کروگے تقسیم تاریخ کو'' ۲۰۰۵ء رمنیکا گپتا کی ہندی نظموں کا ترجمہ

تالیف

۱۱۔ ''نوائے خاموش'' ۔۱۹۸۵ء (خاموش غازیپوری کا مجموعہ)

ظہیر غازی پوری

ظہیر غازی پوری کا تخلیقی سفر پانچ دہائیوں پر محیط ہے جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے یہ نظموں اور غزلوں دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔ ان کے سات شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے بعد اگر کسی کی تخلیق کثرت سے شائع ہوتی ہے تو وہ ظہیر غازی پوری کی شخصیت ہے۔ صرف بسیار گوی اور کیثر الاشاعت ہونا ایک اچھے تخلیق کار کی سند نہیں ہو سکتی۔ یہ ظہیر غازی پوری پر کلیتاً صادق نہیں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تخلیقی بصیرت نے اپنے قلم کا لوہا منوالیا ہے۔ وہ صرف چھپتے نہیں بلکہ معیاری تخلیق سے رسالوں کو معیار بھی بخشتے ہیں۔ وہ بڑے حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ لطیف سے لطیف ترین شئے تک ان کی نگاہ تصور پہنچتی ہے۔ ان کی شاعری ان اشیاء کی شکست وریخت کے ردّعمل کا اظہار یہ ہے۔ اچھے شعر کہنے کے لئے بھاری بھرکم الفاظ کا ہونا ضروری نہیں۔ جیسا کہ دور جدید میں معروف شعراء کے یہاں یہ بدعت عام ہوگئی ہے کہ اچھا شعر کہنا ہو تو ثقیل الفاظ کا استعمال کیا جائے جبکہ شعر اچھا ہو یا نہ ہو اسکی شعریت مجروح ضرور ہو جاتی ہے۔ ظہیر غازی پوری نے اس روش سے اجتناب کیا ہے اور مروّجہ الفاظ کا استعمال اپنے شعروں میں شعری لطف برقرار رکھنے کے لئے کافی سمجھا ہے۔

آ کے سر پر مرے سورج نے کیا ہے احسان
اپنے قدموں پہ ذرا دیر ٹھہر جاتا ہوں

حل ہوا ہے ورق ورق پھر بھی
الجھا الجھا سوال ہے ہر شخص

ہر تعارف پہ جھوٹ کا پردا
واقعی بے مثال ہے ہر شخص

ظہیر غازی پوری نے اپنی شاعری کو ابہام سے پاک رکھا ہے اس لیئے شعر ذہن پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ

ایک دیرپا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔اچھی شاعری وہ ہے جو قاری کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر مثبت روّیہ کی تصدیق کرتی ہو۔مستقبل کی راہ روشن کرتی ہو۔ظہیر غازی پوری کے یہاں اسی قبیل کے اشعار زیادہ ملتے ہیں۔

پردے بہت دبیز تھے چہروں پہ جھوٹ کے
سچ بولنے کی آئینہ جرات نہ کر سکا

بلندیاں مجھے لگتی ہیں پستیوں جیسی
یہ ارتقا بھی برائے زوال لگتا ہے

شاخ در شاخ نئی رت کی تمنا مجروح
زرد پتوں پہ ہوئے دھوپ کے جوہر تقسیم

گاؤں جھوٹا شہر کا بازار جھوٹا ہو گیا
آدمی سچا رہا کردار جھوٹا ہو گیا

محولہ اشعار سے ظاہر ہے کہ انھوں نے مرغ کی چونچ میں سورج کو کھڑا نہیں کیا بلکہ صداقت کی روشنی میں حالات حاضرہ کے تحیّر خیز عناصر کو مشاہدے کی عینک سے دیکھا اور پھر انہیں شعری پیکر میں ڈھال کر مہر تصدیق ثبت کرنے کی خاطر عوام کی زینت بنا دیا۔ان کی شاعری بڑی صاف ستھری اور غیر مہمل ہے ان کی شاعری میں جو سلیقگی اور شائستگی ہے وہ دور حاضر کے معدودے چند شعراء میں دیکھنے کو ملتی ہے انھوں نے شعروں میں الجھاؤ کو کبھی پسند نہیں کیا اور نہ غزل کی روایت سے انحراف کی صورت نکالی ۔انھوں نے ہمیشہ غزل کی زلف سنواری ہے اور اسکی آبرو کا تحفظ کیا ہے۔اپنے منفرد اسلوب سے ظہیر غازی پوری کو دنیائے ادب میں پہچانا جاتا ہے۔ان کی شاعری اپنے ذاتی تجربے کا مظہر ہے۔اتنی طویل مسافرت طے کرنے کے باوجود وہ ادب کی شاہراہ پر خود کو تھکا ہوا محسوس نہیں کرتے بلکہ پہلے سے زیادہ رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔کتابوں کی دنیا میں کھویا رہنے والا شخص جب باہر کی مصنوعی آب و ہوا کا مشاہدہ کرتا ہے تو ذہنوں میں چنگاری سی جل اٹھتی ہے۔وہ بیزار ہو جاتا ہے۔انسانی کرب، چیخ، درد، بے بسی، سفاکی اور بے حسی ان کی شاعری کے موضوعات بن جاتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ میں رونق شہری صاحب کے ہمراہ جب ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا تو وہ کتابوں کی

بھیڑ میں کھوئے ہوئے تھے۔ چاروں طرف کتابیں تھیں۔ دائیں بائیں۔ اوپر نیچے آگے پیچھے۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ تب میں سمجھا یہ شخص اتنا مشاق کیوں ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ شخص اور اردو دونوں لازم وملزوم کی طرح ہیں۔ ساری عمر اردو کی خدمت میں لگا رہنے والا شخص مجاہد اردو ہی تو ہے۔

ظہیر غازی پوری کی شاعری بھی دیگر شعراء کی طرح واحد متکلم کا اظہار یہ ہے۔ انھوں نے شعروں میں خود کو اور اپنے کرب کو ایسا پروجیکٹ کیا ہے جو عوامی کرب کو اُکساتا ہے معنوں انھیں اپنی بے بسی کے اظہاریے کے لئے زبان مل گئی ہو یعنی ظہیر غازی پوری کی شاعری داخلیت سے خارجیت کی طرف مراجعت کرتی نظر آتی ہے۔ واحد متکلم کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

لگ رہی ہے اپنی ہی آواز مجھ کو اجنبی
غالباً میں ہو گیا ہوں اپنے اندر سے جدا
کتنے خانوں میں بٹ گیا ہوں میں
اب مرے 'میں' کا ہے نیا مطلب
اب تو اپنے بھی کئی چہرے نظر آتے ہیں
آئینہ ہوں مگر اس درجہ شکستہ ہوں میں
جسم کے گھر میں کرایہ دار سا لگتا ہوں میں
ذہن پر کیا اب یہی چادر تنی رہ جائے گی
عمر گذری ہے مری ایک ہی برگد کے تلے
میری نظروں میں کوئی اور سراپا کب تھا
شگفتہ رہ کے بکھرنا مرا مقدّر ہے
دیارِ جاں میں کسی پھول کی دعا ہوں میں

اسطرح ہم دیکھتے ہیں ظہیرؔ کے بیشتر اشعار واحد متکلم کی شان گویائی کے مظہر ہیں۔ انھوں نے شعروں میں داخلی کرب کو خارجیت کی نوعیت بخشی ہے۔ جسم کے گھر میں اپنا وجود کرایہ دار لگنا زندگی کی فنائیت کی طرف اشارہ ہے آئینے کا شکستہ ہونا اپنے وجود کا بکھرنا ہے ایک ہی برگد کے تلے خود کو پانا زندگی کی یکسانیت کو ظاہر کرتا ہے اپنے اندر سے خود کو جدا محسوس کرنا بے گانگی کا احساس ہے۔ ''میں'' کا نیا

مطلب انا نیت ہے۔ پھول کی دعا ہونا مقدر پہ اعتبار کرنا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''میں'' کا Involvement محض کسی اشارے اور حوالے کے لیئے پیش کیا گیا ہے خود کو متعارف کرانے کے لئے نہیں۔

میں نے اولین سطروں میں اس کا اظہار کیا ہے کہ انہیں الفاظ برتنے کا ہنر آتا ہے انھوں نے ثقالت سے پرہیز کیا ہے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف الفاظ کی شاعری نہیں کی بلکہ ایک فکری جہت ان کے اشعار میں اندرون تک پیوست ہے۔ انسان کی زندگی میں بہاریں اس دم آتی ہیں جب کوئی تنہائی کا بانٹنے والا ہو، درد کا مداوا ہو۔ جوان دولت بیکراں سے محروم ہے اس کی صبح مایوس اور شامیں پھیکی ہوتی ہیں۔ نگاہیں کسی کی متلاشی ہوتی ہیں۔ ایک صدائے پرسکون کے لیئے روح احساسات کے سمندر میں غوطے کھانے لگتی ہے۔ اس احساس کو الفاظ کی گرفت میں کرنا ایک زبردست مشاق فنکار کا کام ہے۔ ظہیر غازی پوری نے اس کرب کو محسوس کیا ہے۔

ہم تو سرسبزی کے قائل ہیں ہمیں معلوم کیا
کس طرح ہوتی ہے بے پتہ شجر میں زندگی

یہاں بے پتہ شجر بے سروسامان اور شکست خوردہ معلوم پڑتا ہے جیسے اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے۔ بے پتہ شجر زندگی سے بیزاری کا اظہار یہ ہے۔ پتے شجر کی زندگی کی علامت ہیں۔ شجر اس سے سر سبز و شاداب نظر آتا ہے۔ پیڑ کی شگفتگی اور شائستگی اسی پر قائم ہے۔ پتے پیڑوں کے لئے لباس فاخرہ ہیں۔ اس کے اتر جاتے ہی پیڑ بالکل برہنہ اور بےلباس ہو جاتے ہیں۔ بس اسے زندگی کا ایک اہم پہلو تصور کرلیا جائے تو زندگی اجیرن سی ہو کر رہ جائے گی لیکن انسان اس کرب سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اپنی تجدیدی کوشش میں وہ اندر سے ٹوٹ ضرور جاتا ہے لیکن حوصلہ نہیں چھوڑتا۔

زندگی ہے کہ بکھرتا ہوا سایہ کوئی
یہی کیا کم ہے کہ ایسے میں سلامت ہوں میں

ظہیر غازی پوری نے آپسی تفریق، ہندو مسلم فسادات اور اخلاقی قدروں کی پامالی کو اپنے شعروں میں

قلم بند کیا ہے مذہبی جنون کی لہروں میں انسان اتنی دور نکل جاتا ہے کہ ساری قدر ٹوٹ کر تار تار ہو جاتی ہیں جب جنون کا پہاڑ سر سے اترتا ہے تب تک دونوں جانب سے بہت کچھ کھویا جا چکا ہوتا ہے۔ بربادی کی اس داستان کے اظہار سے ظہیر اپنے شعروں میں صرف کرب اور حزنیہ رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ روشن مستقبل کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔صرف انقلاب لانے اور لہو گرمانے کی کوشش کا نام شاعری نہیں ہے۔ بلکہ مثبت رویے کا رجحان پیدا کرنا بڑی بات ہے۔ظہیر غازی پوری نے اپنی شاعری میں تبلیغِ انسانیت کا پرچم بلند کیا ہے۔ماحول کی شادابی کی پھر سے تمنا کی ہے۔آج اس شدید آگ کی لپٹیں پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں اس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی ذی روح نہیں رہ سکتا۔شاعر کا دل چیخ اٹھتا ہے۔امن و آشتی، خیر سگالی کی خاطر پیش قدمی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اس بدلتے ہوئے حالات سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا ایک روشن چہرہ دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔اس قبیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لہولہان بھی، پیاسا بھی، پرسکون بھی ہوں
خود اپنے آپ میں تاریخ کربلا ہوں میں

جو چاٹ کر نہ آئی ہو انسان کا لہو
ایسی کوئی نمود سحر مانگتے ہیں لوگ

یہ حادثہ تو کئی بار زندگی میں ہوا
خود اپنا جسم بھی جب اپنا ہم سفر نہ رہا

کرفیو کی بات سنتے ہی منظر بدل گیا
سب رہ کے ہوش میں بھی بہت بدحواس تھے

یہی تشریح لفظ ارتقا ہے
کہ اب انسان درندہ ہو گیا ہے

بہت زر خیز ہے مٹّی یہاں کی
شجر فتنوں کے جو چاہے لگائے

تاحدّ نظر آگ کے شعلے ہیں دھواں ہے
اس ملک کی قسمت میں ہے جلتا ہوا موسم

ظہیر غازی پوری کی شعری کائنات وسیع تر معنیاتی نظام کی حامل ہے۔انہوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنے فکروفن کے کمالات دکھائے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ ظہیر کے سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کی نثر عمدہ ہے یا شعر۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی میدان میں یہ فکروفن کے دائرے سے نکل کر گمرہی کے جنگل میں روپوش نہیں ہوجاتے ہیں۔اس ضمن میں ظہیر شناسی کیلئے ان کے ہی معتبر شاگرد حنیف ترین کی کتاب ظہیر غازی پوری شخص، شخصیت شاعری کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ اس کتاب میں مقتدر اہل قلم حضرات نے اپنے قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔خودمرتب حنیف ترین نے ظہیر غازی پوری پر لکھے مضامین کی ابتدا غزل سے ہی کی ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ ظہیر کی شاعری کا وافر حصہ غزلوں پر ہی مشتمل ہے حالانکہ انھوں نے باضابطہ نظمیں کہی ہیں اوران کی ایک قابل لحاظ تعداد کتابوں اور رسائل میں محفوظ ہیں۔مشترکہ مجموعہ تثلیث فن میں بھی ظہیر غازی پوری کی نظمیں ہی شامل ہیں۔میری دانست میں ظہیر غازی پوری غزل سے پہلے ہی ایک کامیاب نظم گو کی حیثیت سے مستحکم ہوچکے ہیں۔انھوں نے ذائقہ بدلنے کیلئے آزاد غزل بھی لکھی ہے اور بانی کی حیثیت سے بھی مدعی رہے ہیں۔رباعیات کے باب میں ظہیر غازی پوری کی اپنی پہچان ''دعوت صد نشتر'' کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔حال کے دنوں میں دوہے پر بھی ان کی کتاب آگئی ہے۔'دوہے' کو بحیثیت صنف مستحکم کرنے کے لئے ظہیر کی تنقیدی تحریریں مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ظہیر غازی پوری کی نظم نگاری کے سلسلے میں مرحوم ڈاکٹر خورشید جہاں نے صحیح فرمایا ہے کہ ''جو تصور غزل کے کسی ایک شعر میں بیان ہوسکتا ہے ظہیر غازی پوری انہیں چند سطروں یا مصرعوں میں پھیلانے پر قادر ہیں'' اس ضمن میں ان کی کئی نظموں کے حوالے پیش کئے جاسکتے ہیں ان کے متعدد شعری مجموعوں میں تثلیث فن، الفاظ کا سفر آشوب نوا، کہرے کی دھول اور سبز موسم کی صدا شائع ہوکر مقبولیت کی بلندی کو حاصل کر چکے ہیں۔''الفاظ کا سفر'' کی کچھ نظموں اور کہرے کی دھول کی تقریباً تمام نظمیں اپنی رنگا رنگی، وسعت خیال، عصری رمق کی وجہ سے قابل توجہ رہی ہیں۔ظہیر غازی پوری کے متعلق یہ کہنا کہ وہ جامد خیال کو بھی وسعت دینے پر قدرت رکھتے ہیں صحیح نہیں ہوگا۔اس لئے کہ ان کے یہاں مختصر نظمیں بھی ہیں جو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہیں کے زمرے میں آتی ہیں۔رباعی گوئی ایک مشکل فن ہے اس میں خیال کی مرکوزیت محدود پیمانے پر سمیٹتے ہوئے آخری مصرع میں کمال فن کا مظاہرہ کیا

جاتا ہے اس ضمن میں بھی ظاہر ہے ظہیر غازی پوری نے استادفن ہونے کا مظاہرہ کیا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل رباعیاں میرے اسی دعوے کی بینؔ ثبوت ہیں۔

میدان ہے وادی ہے جبل ہے دنیا
مرعوب جو ہوتی نہیں پتھر سے کبھی
مردم کش و آزار دہندہ انسان
بے بس نظر آتی ہے مشیت بھی جب
ٹوٹی ہوئی بنئے کی ترازو کی طرح
اس ملک میں بے گھر نہ کبھی کی جائے
تعریف نہ تحسین نہ غلو مانگتی ہے
ہم جس کو غزل کہتے ہیں شاعر سے
اب سایۂ اشعارِ غزل میں آجا
دعویٰ ہے مرا تجھ کو ملے گی عظمت

تجدید خیالات غزل ہے دنیا
وہ شیشہ صفت خواب محل ہے دنیا
فطرت ہی سے لگتا ہے درندہ انسان
انسان کو کھا جاتا ہے زندہ انسان
انسان کے اندر پلی بدخوکی طرح
کوئی بھی زباں اب مری اردو کی طرح
احساس شگفتہ کا غلو مانگتی ہے
جب مانگتی ہے دل کا لہو مانگتی ہے
خم خانۂ معیارِ غزل میں آجا
اک بار تو دربار غزل میں آجا

اس لئے مجموعی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ظہیرؔ ایک حساس طبیعت کے مالک ہیں۔یہی ذکی الحسی اپنی ہمہ وقت شعروادب کے گیسوسنوارنے میں منہمک رکھتی ہے۔مختلف اصناف سخن میں ان کا خلوص یکساں جھلکتا ہے لیکن جہاں جہاں اظہار کی شدت غالب آجاتی ہے وہاں ظہیرؔ کی پہچان قائم ہو جاتی ہے۔فکروفن پر نوحہ گری کا مادہ ظہیر کے یہاں اسلئے بھی زیادہ ہے کہ انھوں نے مکروہ روش کی پذیرائی نہیں کی ہے۔اس لئے ظہیر غازی پوری ایک محترم شخصیت کا نام ہے جنکا اردوادب میں بلند مقام ہے۔

پرکاش فکری

نام : ظہیرالحق

قلمی نام : پرکاش فکری

والد : محمد ذکریا

تاریخ ولادت : اگست ۱۹۲۹

جائے ولادت : ہمبالہ، ہریانہ

ملازمت : اکاؤنٹنٹ جنرل آفس (بہار) رانچی

تعلیم : میٹرک

تصانیف : سفر ستارہ۔ شعری مجموعہ

ایک ذرا سی بارش۔ شعری مجموعہ

اعزازات : خسرو ایوارڈ۔ ۲۰۰۵

ساہتیہ اکادمی کا انعام برائے ترجمہ (امرت لال ناگر کا ناول)

ادبی سفر کا آغاز : ۱۹۶۱

مستقل پتہ : پراس ٹولی۔ ڈورنڈہ۔ رانچی

پرکاش فکری

پرکاش فکری کا نام جدیدیت کے بنیاد گذار شعراء میں ہوتا ہے۔ زمانہ جدیدیت میں جدیدیت کے علمبردار شعرا کی بھی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے لیکن بنیاد گذار ہونے کے لیئے جو شرطیں کسی بھی آئیڈیالوجی یا تھیوری کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں اس میں فنکار کی اس عہد کی وابستگی کا زیادہ دخل ہے۔ روایت ترقی پسندی اور جدیدیت کے تین مدارج الگ الگ مطالعہ کے متقاضی ہیں۔ چونکہ پرکاش فکری اچانک ہی جدید غزل گویوں کی بھیڑ میں شامل نہیں ہو گئے اس لئے شاعر مذکور کے متعلق سب سے پہلے ان اسباب وعلل کا پتہ لگانا ضروری ہوگا جو ترقی پسندی کے عہد میں شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ ایسا بھی نہیں کہ روایت کا حسن و جمال، ترقی پسندی کی شدت پسندی کی ہوا انہیں لگی ہی نہ ہو۔ پرکاش فکری کی طویل غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبل از زمانۂ جدیدیت ان کا ذہن کس طرف سوچتا رہا ہے۔ غزلوں میں خصوصاً ترقی پسند شاعری کے عہد میں ان کے یہاں بلند بانگ دعوے یا تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والی غزلیہ شاعری کے لیئے اعلانیہ طور پر کبھی خود کو Committed ہو کر پیش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرکاش فکری کو تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ عام درجے کا شاعر ہوتا تو ترقی پسندی کے دور میں بھی اپنے باغیانہ لہجے سے اس عہد کی شاعری سے متاثر ہو کر خود کو Project کر سکتے تھے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پرکاش فکری کا ذہنی رویہ شروع سے دانشورانہ رہا ہے۔ ایک دانشور مورخ بھی ہوتا ہے فلسفی بھی۔ مورخ ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ تاریخی کتب کا حوالہ بن جائے۔ Legend ادبا شعرا جو ہوتے ہیں ان کا عہد کے ساتھ کوئی تحریری اقرار نامہ نہیں ہوتا ہے کہ کس خانے میں وہ فٹ کئے جائیں۔ پرکاش فکری کا عمیق مطالعہ کرنا لفف صدی پر محیط ادبی منظرنامے پر گہری نگاہ رکھنا ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ترقی پسندی کے دور میں بھی انہوں نے تحریک کی نہیں بلکہ رجحان کی شاعری کی ہے۔ شعر وادب میں جدیدیت ایک ایسی اصطلاح ہے جس کو مختلف مکتبۂ فکر کے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر تشریحات پیش کی ہیں۔ یہ تو طے شدہ ہے کہ جدیدیت کی لہر کو روکنے میں ترقی پسندی کا کوئی ہمالہ کامیاب نہ ہو سکا اس کے لیئے سیاسی سماجی اور تہذیبی وجوہ ذمہ

دار ہیں۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ہر شئے تغیّر پذیر ہے۔ پرکاش فکری کا ذہن بھی شعروادب میں بدلتی ہوئی صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پرکاش فکری ماضی، حال اور مستقبل کی ان دردانگیز صورت حال کو اپنی طبعیت کا حصّہ بناتے رہے ہیں۔ مطالعہ ومشاہدے کے باہم اتصال سے اشعار میں نئے پیکر ابھارتے رہے ہیں۔ ان کے معاصرین میں ظفر اقبال، عادل منصوری، سلطان اختر، بانی، مظفر حنفی، مظہر امام جیسے رجحان ساز شعرا رہے ہیں۔ ان میں پرکاش فکری نے اپنے مدھم مدھم لہجے، ہلکی ہلکی سوزش، جگنو جگنو روشنی سے نہ صرف چونکاتے رہے ہیں بلکہ ایک ایسے لہجے سے شعروادب کے قارئین کو روشناس کراتے رہے ہیں جو ان ہی کا حصّہ ہے۔ یہ اپنے لہجے کے مبتدی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ مبتدی اسلیئے کہ جہاں سے انہوں نے شعری سفر شروع کیا تھا وہاں کچھ ایسے کلیدی الفاظ ان کی غزلیہ شاعری میں شروع سے موجود رہے ہیں جو پرکاش فکری کی شخصیت سے ہم آہنگ ہوکر برملا اظہار کے بین ثبوت بنے ہیں۔ پرکاش فکری کے ذہن پر ماضی کی پرچھائیاں راستے کی رکاوٹ نہیں بلکہ منزل آشنا نگاہوں کے قریب گھومتی ہیں پرکاش فکری نے اپنا ایک مخصوص حزنیہ رنگ شروع سے ہی اختیار کر رکھا ہے جو مشق و مزاولت سے ان کی طبعیت کا حصّہ بن گیا ہے۔ بڑا شاعر ہونے کے لئے ماضی پرست ہونا ضروری نہیں لیکن ماضی کے جلتے واقعات وحادثات سے صرف نظر کرنا بھی صحیح نہیں ہے اس لئے پرکاش فکری نے اپنے مزاج میں شروع سے ہی ماضی کی سدابہار قدروں اور اسکی شکست وریخت کا ماتمی لہجہ نوحے کی شکل میں پیش کردیا ہے جہاں تک حال کی بات ہے یعنی عہد موجودہ اس سے پرکاش فکری کی ذہنی ہم آہنگی میں فطری لگاؤ موجود ہے۔ پرکاش فکری کا دکھ شیروانی پر ٹانکہ ہوا خوبصورت بٹن کی طرح نہیں ہے بلکہ عہد حاضر کی بے لباسی اور لمحوں کی بدوضعگی کا اظہار یہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ آدمی کو ہوا کا رخ دیکھ کر سفر طے کرنا چاہیئے اس کا اطلاق زمانہ، حال پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ پرکاش فکری نے فیشن زدگی کے طور پر کبھی اس شغل کو اختیار نہیں کیا جو کسی بھیڑ چال کا حصّہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ پرکاش فکری کے یہاں وحدت تاثر ہر حالت میں قائم رہتی ہے۔ اردو شعروادب میں کئی ایسی مثالیں ہیں جو ہمارے مطالعہ کا دلچسپ حصّہ بن سکتی ہیں۔ ایسے شعرا بھی ہیں جو زمانہ ترقی پسندی میں نعرے بازی کی شاعری کی یا پھر تحریک کے زیر اثر رہ کر ولولہ انگیز اشعار کہے اور پھر جب عہد جدیدیت آیا تو اس کے نام نہاد قبیلے میں بھی شامل ہوگئے یا پھر کچھ لوگوں نے گندی پوشاک سمجھ کر اپنا لہجہ ہی بدل لیا۔ لہجے کا یہی مصنوعی فن بہت سارے شعرا کی بے وقعتی کا سبب بنا۔ پرکاش اس

معاملے میں سب سے جداگانہ ہیں۔انھوں نے نمائش کے طور پر نہ ترقی پسندانہ شاعری کی اور نہ مبہم اور مہمل جدید غزلیں کہیں۔ ان کی شاعری میں شروع سے ہی ترسیل وابلاغ کا مسئلہ نظر نہیں آیا۔ صاف شفاف آئینے کی طرح پرکاش فکری کا چہرہ حال کے آئینے میں بھی منوّر رہے۔ اردوغزل میں مصیبت یہ ہے کہ اپنے پیش رووں میں کئی قدآور شعرا کے اثرات سے بچنا مشکل ہے۔ کاجل کی اس کوٹھری سے کوئی صحیح سلامت نکل آئے یہی بہت ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ پرکاش فکری نے اس طور سے بھی اپنی پیشانی کو داغدار ہونے سے بچائے رکھا۔ شاید دانشوری کا مفہوم بھی یہی ہے۔ زندگی کے دو چہرے ہیں اس کا دورخہ چہرہ اچھے اچھوں کو مغالطے میں مبتلا کرنے کے لیئے کافی ہے۔ پرکاش فکری بھی حیات کے کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی کے دو رنگ طربیہ اور حزنیہ ہیں۔ بچّے کی کلکاری اور ضعیف کے آنسو ٹریجڈی اور کامیڈی کی روشن مثالیں ہیں۔ان کی شاعری میں کسی خوابیدہ بچّے کی مسکراہٹ جہاں دیکھنے کوملتی ہے وہیں زندگی کرنے کے ہنر میں درپیش مصائب کی وجہ سے رخسار حیات پر جلتے آنسو کی بھی گرمی دیکھنے کوملتی ہے۔ اردو شاعری میں حزنیہ رنگ شروع سے ہی مقبول ومشہور رہا ہے۔ خواجہ میر درد ہوں یا میر تقی میر ہوں یا ناصر کاظمی یا احمد فراز ہوں سبھوں کے یہاں بچّوں کی مسکراہٹ پر آنسو کی تیزابیت قربان نہیں ہوتی ہے بلکہ مسکراہٹ کی اہمیت کو کم کرتی ہے۔ مذکورہ شعرا نے اپنے اپنے ڈھنگ سے زندگی کی تشریح کی ہے۔ پرکاش فکری کا رویہّ اپنے عہد کے حزنیہ رنگ کا معقول جواز کہا جاسکتا ہے۔ پرکاش فکری کے یہاں زندگی کے مسائل اس کے ٹوٹتے بکھرتے نقوش کو دیکھ کر الگ ہی طرح کا رنگ ملال پیدا ہوتا ہے اس رنگ ملال میں پرکاش فکری کے ذاتی دکھ کا بھی ایک رنگ شامل ہوتا ہے جو دور سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں واقعات وسانحات کی کڑیاں بیانیہ انداز میں یا خطابیانہ لہجے میں نہیں ملتی ہیں بلکہ علیحٰدہ علیحٰدہ اجزا بن کر کل کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ نئی غزل یہ کا المیہ یہ بھی ہے کہ ادھوراپن عدم تکمیلیت اس کا خاصہ ہیں پرکاش فکری واقعات وسانحات کی لرزہ خیزی کو بیان کرنے کا کوئی ایسا شعوری طریقہ کار نہیں اپناتے جس سے تحیرّ کی فضا کی تشکیل ہو ان کا اپنا Involvement اس عمل سے روک کر رکھتا ہے۔ نئی غزل کے مزاج داں کہلانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے عہد کی سچّائیوں کو مشاہدۂ حق بنا کر کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ شاعر کی اپنی فطری جودت طبع پر منحصر ہے کہ کس طرح زندگی کے ٹوٹے اور بکھرے ریزے کو چن کر جدید عہد کے انسان کا

المیہ بنا کر پیش کرے۔ پر کاش فکری کے یہاں حزنیہ رنگ نوحہ گیری کے زمرے میں نہیں آتا ہے ان کے یہاں ایک ٹیس، درد موجود ہے جو پر کاش فکری کی طبیعت سے متعلق ہے کسی بھی بڑی شخصیت کی تلاش و جستجو میں کامیابی تبھی ممکن ہے جب اسکی خارجی شخصیت سے داخلی شخصیت کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ پر کاش فکری ظاہراً جیسا نظر آتے ہیں باطناً ان کی شاعری میں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ اپنی ہی شخصیت کے ایک کونے میں دُبک کر بیٹھنا اور زمانے کے گردو پیش صورت حال سے آگہی رکھنا بھی پر کاش فکری کا اپنا نجی معاملہ ہے پر کاش فکری کے حوالے سے اگر اشعار نقل کئے جائیں تو سینکڑوں اشعار ان کے حرف ولفظ کے منفرد سلوک کو ظاہر کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

پر کاش فکری کے سلسلے میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص حزنیہ رنگ ان کی شاعری میں دیکھنے کو جا بجا ملتا ہے۔ حزنیہ رنگ کی بات چلی تو کہتا چلوں کہ اس کے کئی مترادفات ہیں جیسے رنج۔ الم، دکھ، اذیت، کرب، ملال، افسردگی وغیرہم۔ یہ ساری چیزیں کسی ایک شاعر کی فکری اساس بن جائیں تو ان میں شاعر کی اپنی شمولیت کو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن پر کاش فکری جیسے مجروح شاعر کے لئے محولہ مترادفات کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اسلئے کہ ان کے یہاں حزن وملال کا جو رنگ دیکھنے کو ملتا ہے اس میں لفظ اداسی کلیدی رول کر رہا ہوتا ہے۔ لفظ اداسی ایک عام فہم صفت ہے لیکن انھوں نے اپنے شعر میں جس تخلیقی ہنر کاری کے ساتھ اسے پیش کیا ہے وہ فکری کی کائناتِ شاعری میں گونج کا اصل محرک بن گیا ہے مثال کے طور پر درج ذیل اشعار بطور حوالہ پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اداسی میں لپٹی ہوئی شام آکر
اداسی میں سب کو ڈبونے لگی ہے

پھولوں والا موسم شاید دستک دے کر لوٹ گیا
ہم نے جواب کھڑکی کھولی سب کچھ پھیکا لگتا ہے (اداسی)

سمجھیں گے اپنی عمر کا قصہ تمام ہے
رنگ خزاں کو دیکھکر جس روز ڈر گئے (اداسی)

چار جانب وہی بے جان سپیدی کیوں ہے
میری ہر صبح کسی شام سے لپٹی کیوں ہے (اداسی)

جشنِ سالِ نو مناکر لوگ لوٹے شہر کو
پھر اداسی کے حصاروں میں گھرا وہ آبشار

اُجڑتے منظروں کے سوگ میں ڈوبے سبھی چہرے
فضاؤں سے برستی ہے اداسی آنسوؤں جیسی

رفتہ رفتہ سب مناظر کھوگئے اچھا ہوا
شور کرتے تھے پرندے سو گئے اچھا ہوا

بے سبب روتا تھا فکری اور رلاتا تھا ہمیں
اب زمانہ ہوگیا اس کو گئے اچھا ہوا

تاریک پربتوں میں سورج نے جان دے دی
ٹھنڈا اداس کہرا بستی پہ ڈولتا ہے

شام ہوتے ہی اندھیرا گھیرلیتا ہے ہمیں
پھیردیتا ہے اداسی رونقِ بازار پر

ان محولہ اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اداسی کے ایک بلیغ مفہوم کو نئی شعری زبان سے خوش پوشی عطا کی ہے اکثر ہوتا ہے کہ ہر طرح کے شعراء کے یہاں رنج وملال کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔ حس و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ شعرا کی درجہ بندیِ بھی حزنیہ رنگ کے اچھوتے پہلوؤں پر ذہن کی آنکھ کو مرکوز رکھ کر کی جاتی رہی ہے ناخدائے سخن میر سے ناصر کاظمی تک حزنیہ رنگ مختلف کیفیتوں سے ہم آہنگ ہوکر فضائے شاعری پر چھا گئے ہیں پرکاش فکری، ناصر کاظمی کے حزنیہ رنگ کو کہیں اختیار نہیں کرتے بلکہ رنج وملال کی ایک الگ مخصوص سطح کو منوّر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حوالے کے طور پر پیش کئے گئے اشعار میں لفظ اداسی کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ پرکاش فکری نے اداسی کی بھی کئی مترادفات پیش کی ہیں اس کے باوجود خسارے کا سماں اداسی کی پوشاک پہن ہی لیتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اشیائے ظاہری ہوں یا قدرتی مناظر سبھوں کے یہاں زوال پذیر عمل جاری وساری ہے پرکاش فکری اسی خسارے یعنی Depreciation کو مترشح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میری سمجھ سے اسطرح کے مبادیات ان کی کئی معاصرین کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن لفظ 'اداسی' کی

ہمہ گیریت اور اسکی شانِ نزول کو پرکاش فکری جس ڈھنگ سے برتتے ہوئے نظر آتے ہیں اس میں کہیں سے تصنع کا گمان نہیں ہوتا۔ میری سمجھ سے اسکی کئی وجوہ ہیں پہلی تو یہ ہے کہ پرکاش فکری مظاہر کائنات کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھتے ہیں اس عینک سے اداسی کا بھرپور عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ پرکاش فکری اپنی جلوہ سامانیوں میں قارئین وسامعین کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پرکاش فکری کے یہاں غزلوں میں شعر کی قرأت کا اپنا ہی ذائقہ ہے اسکی وجہ بھی فطری طور پر اداس لمحوں کا نوحہ بیان ہونا ہے۔ پرکاش فکری کی شاعری میں 'اداسی' ایک مخصوص رنگ میں ڈھل کر پیش ہوئی ہے۔ یہاں 'اداسی' یاسیت لفظ کے متبادل کے طور پر استعمال کرنے میں اس بات کا خدشہ لاحق ہوسکتا ہے کہ فکری کے یہاں فرسٹریشن سے پیدا شدہ کربنا کی کہیں اداسی کا جواز نہ بن جائے۔ اسلئے پرکاش فکری کی اس معاملے میں بھی فکری جہت عامیانہ نہیں ہے۔ ان کی اداسی میں روبہ زوال شادمانی میں ایک مخصوص طرح کا پھیکا پن محسوس کرنے کی چیز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی معصوم بچے کی وہ پاک کوشش رائیگاں چلی گئی ہو جو اپنی چٹکیوں سے ہری گھاس پر بیٹھی تتلی کو پکڑتے پکڑتے رہ گیا ہو۔ یا زندگی کی تیز رفتار گاڑی خلافِ توقع کھلتے ہی اسپیڈ میں آگئی ہو اور پرکاش فکری سوار ہونے سے رہ گئے ہوں۔ خواہشات کی عدم تکمیلیت اور محرومی سے پیدا شدہ انتشار نئی غزلوں میں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ پرکاش فکری کے یہاں اس کے باوجود کہیں سے جھنجھلاہٹ موجود نہیں ہے یہ خود کو واقعات و سانحات کے سپُرد کرنے کے برخلاف احتجاج میں مدھم مدھم شدت کی کیفیت پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پرکاش فکری اپنے معاملات زندگی کو سانحہ بنا کر پیش نہیں کرنا چاہتے اسلئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے معاشرہ ترحم آمیز لہجہ کو کس پست خیالی سے دیکھتا ہے۔
جھارکھنڈ میں کم وبیش لقف درجن ایسے شعرا موجود ہیں جو ان کے معاصرین کی صف میں کھڑے کیئے جاسکتے ہیں ظہیر غازیپوری، وہاب دانش، صدیق مجیبی، منظر شہاب وغیرہم ناقدین کی نگاہ میں بحیثیت جدید شاعر پرکاش فکری پر ہی نگاہ پڑتی ہے اسکی کئی وجوہ ہیں۔ معاملہ یہ بھی ہے کہ تجارت اور ادب میں تسلسل اور تواتر کی بڑی اہمیت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسائل وجرائد کے ذریعہ کسی نہ کسی صورت پرکاش فکری خود کو Project کرنے میں زیادہ کوشاں رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ غزل کے بنیاد گذار شعرا میں بطور حوالہ ان کا نام لئے بغیر کوئی تقریر مکمل ہوسکتی ہے اور نہ تحریر لائق اعتبار ٹھہر سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ ریاست بہار سے کٹ کر جھارکھنڈ کا اپنا ایک چہرہ منوّر ہو چکا ہے اور سیاسی، سماجی،

تہذیبی سطح پر اس نوتشکیل شدہ ریاست اپنی پہچان بنانے کے لئے شب و روز پیش رفت کر رہی ہے۔ لسانی و ادبی سطح پر بھی جھارکھنڈ ایک علیحدہ شناخت رکھنے والی ریاست کی حیثیت سے اُبھر چکی ہے۔ جھارکھنڈ کی راجدھانی کی حیثیت سے رانچی کا نام جھارکھنڈ کے بڑے شہروں میں اولیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ چونکہ پرکاش فکری اسی راجدھانی میں بود و باش اختیار کرتے ہیں۔ اسلئے بڑے شہر کے کلچر کے اثرات کو ان کے ذہن پر مرتسم ہوتے دیکھا جا سکتا ہے کثرت سے آباد آدی باسیوں کی ریاست جھارکھنڈ کی الگ ہی تہذیب ہے۔ شروع سے ہی گاؤں سے جڑی رانچی اب وہ رانچی نہیں جہاں غریبی کی لعنت طوق بن کر ہر گلے میں موجود تھی۔ رانچی کی آب و ہوا انگریز کے زمانے سے ہی صحت افزا رہی ہے لیکن صنعتی ترقی کے بعد یہ خوش فہمی بھی ختم ہو کر رہ گئی ہے کہ رانچی کی آب و ہوا پہلی جیسی صحت بخش ہے۔ کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ صنعتی شہر کے کالے دھوئیں کی تہذیب رانچی کو بھی نگل چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شہر میں پرکاش فکری جیسا جدید شاعر بھی رہتا ہے اسلئے حساس شاعر کی شاعری میں بھی رانچی راجدھانی کی بدلتی ہوئی صورت حال پر بھرپور بتصرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ رانچی میں ان کے معاصرین میں وہاب دانش، صدیق مجیبی جیسی شخصیتیں ہیں۔ وہاب دانش انتقال کر چکے ہیں۔ صدیق مجیبی خرابیٔ صحت کے باوجود شعر و ادب کی زلف سنوارنے میں مصروف ہیں۔ رانچی میں صدیق مجیبی، پرکاش فکری، وہاب دانش کی تثلیث شروع سے ہی کھڑی کی جاتی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم سر بھی کہے جا سکتے ہیں۔ جسطرح تین خطوط کی یکجائی سے مثلث کی تعمیر ہوتی ہے اسی طرح حالیہ برسوں میں وہاب دانش کے انتقال سے پہلے تک رانچی میں تینوں حضرات کی تثلیثی تکرّم کے زیر اثر یہاں کا ادب پروان چڑھتا رہا ہے۔ تینوں حضرات میں پرکاش فکری کا رول نئی ذہانت کو فروغ دینے میں براہ راست طور پر دکھائی نہیں دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے لہجے کے تنہا وارث دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف رانچی کے نوجوان شعراء پر صدیق مجیبی کا اثر ابتدائے زمانۂ جدیدیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہاں میں قصداً ان لوگوں کا نام لینا گوارہ نہیں کروں گا اس لیئے کہ فی زمانہ قوت برداشت کا مادہ نئی نسل میں کم ہی ہے۔ ایک دوسری خصوصیت بھی پرکاش فکری کو ان کے رانچی کے معاصرین میں الگ کرتی ہے وہ ہے بزم سازی کا عدم رجحان۔ پرکاش فکری کے متعلق بہتوں کا خیال ہے کہ تنہائی، جو قرب خداوندی کیلیئے لازمی ہے انہوں نے یہی رویہّ شاعری کے لیئے اپنایا ہے۔ اور یہی ان کی طبیعت کا خاصہ بن کر عادت میں بدل گئی ہے۔ شور ہنگامے سے دور

پرکاش فکری اپنے لئے شروع سے ہی مخصوص حسنِ سلوک کے متقاضی رہے ہیں۔ یہی درد اور ٹیس ان کی شاعری میں اداسی کا روپ اختیار کر چکے ہیں۔ پرکاش فکری کی اداسی میں نہ ظفر اقبال کا استہزائیہ روپ ہے نہ عادل منصوری کا تلخ مشاہدہ، بانی کی طرح نئ شعری کائنات تلاش کرنے کی شعوری جستجو ہے اور نہ بشیر بدر کے الفاظ کے فینٹیسی کا جادو۔ یعنی پرکاش فکری کی شاعری خارجیت کے بھرپور امکان سے مملو ایسی تخلیق ہے جو نگاہ کے راستے دلوں میں اترنے کا راستہ خود بہ خود طے کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار کی سائیکی پر اگر ہم غور کرتے ہیں تو پرکاش فکری کو تلاش کرنے میں کوئی خاص دشواری محسوس نہیں ہوتی ہے۔

کل تلک لپٹی تھیں جن سے خامشی کی ناگنیں
ہیں پرندوں کے بسیرے اب انہیں اشجار پر
برف سے ٹھنڈے اندھیروں کی سسکتی گود میں
مرتے لمحوں کی اداسی دل میں کانٹے بو گئی
کیوں بیاباں میں کھڑے ان بولتے اجڑے شجر
پیاس کی سوکھی زباں سے ابر کا قصہ سنیں
اپنے ملبوس کے رنگوں میں اداسی نہ چھپا
سرد ہونٹوں پہ جمی برف کو اب تو پگھلا
شاموں کو اداسی کی اڑتی ہیں ابابیلیں
راتوں کو خموشی کا آسیب ستاتا ہے
یہ اس کا خطہ ہے جس میں تھکن اداسی کی
ہر ایک لفظ کی آنکھوں سے جھانکتی دیکھی

درج بالا اشعار میں پرکاش فکری نے 'اداسی' کو بہروپئے کی طرح پیش کیا ہے۔ کبھی وہ اشجار کے حوالے سے کبھی برف سے ٹھنڈے اندھیرے کے ذریعہ، کبھی مرتے لمحوں کے تقابل سے، کبھی ملبوس کے اڑتے رنگوں کے انعکاس کو مدّ نظر رکھکر پرکاش فکری نے اداسی، کو ایک مستقل اشاریہ کے طور پر پیش کر

کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا ذہنی رویہ اسی پر قائم ودائم ہے۔

جھارکھنڈ کے کئی اہم شعراء کئی دہائیوں تک مستقل طور پر شاعری کرنے کے باوجود شعری مجموعے کی اشاعت میں کوتاہی برتتے رہے ہیں۔ لفظ کوتاہی میں نے دانستہ طور پر اس لئے بھی استعمال کیا ہے کہ پرکاش فکری ابتدائے زمانۂ جدیدیت سے ہی کثیرالاشاعت شعراء میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ رسائل وجرائد میں تواتر سے تخلیقات کی اشاعت سے ان کی غزلوں کے مخصوص قارئین پیدا ہوگئے ہیں جو اپنی ہی عینک سے پرکاش فکری کی ذات کے حوالے سے اشعار کے قرب کی رسائی حاصل کرتے رہے ہیں بھلا ہو جابر حسین کا جنہوں نے پرکاش فکری کو پہلے مجموعے کی اشاعت کیلئے رضامند کیا۔ اس مجموعے کا نام غالباً سفر ستارہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی تازہ ترین کتاب "ایک ذرا سی بارش" میں اس کا انکشاف بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اسکی شاید وجہ یہ رہی ہو کہ پرکاش فکری جس تام جھام سے اپنی شعری کتاب شائع کرنا چاہتے تھے شائع نہ ہوسکی۔ اب "ایک ذرا سی بارش" افق ادب پر طلوع ہوئی ہے۔ نئی شاعری کا بالکل ایک نیا منظر نامہ سامنے آیا ہے نام کے اعتبار سے معنویت تلاش کرنے میں اس لیئے بھی دقّت پیش نہیں آتی کہ گمان کے برخلاف کالی گھٹاؤں کی موجودگی کے باوجود "ایک ذرا سی بارش" نامکمل سیرابی کی ایک حزنیہ داستان پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ عام درجے کا شاعر ہوتا تو "ایک ذرا سی بارش" کی معنویت کو میں اقبالؔ کے اس شعر کے ساتھ کتاب میں ٹانک لیتا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

لیکن پرکاش فکری سے یہ عامیانہ رویہ اختیار نہیں کیا جاسکا۔ مزید برآں نہ رونق نعیم کی طرح گھٹاؤں کے پاؤں میں گھنگھرو بندھنے کی شعری نزاکت کے باوصف سیلاب کا خوف پرکاش فکری کے ذہن پر طاری ہوسکا اور نہ رونق شہری کے مور کا رقص اور کالی گھٹا کی موجودگی سے پیدا شدہ آفتوں کے نزول کا شائبہ فراہم ہوسکا۔ "ایک ذرا سی بارش" کی تشنگی در تشنگی کا معاملہ فکری کے نامکمل سلسلۂ انبساط سے فطری طور پر جڑا معلوم ہوتا ہے۔ میرے اس دعوے کے بین ثبوت کیلئے درج ذیل اشعار پیش کرنا کافی ہونگے۔

وہ جو سرسبز ہوا دیکھ کے بارش کا سماں
خشک صحرا کا کوئی حال سناؤ نہ اسے
بادل برسنے آئیں تو تو جھومے گی موج میں
بجلی کی تیز آنکھ سے ڈر جائے گی یہ شاخ
ان دنوں دریا تھے سوکھے بارشوں کی رت نہ تھی
ریت کی لہروں پہ کشتی پھر چلاتے کس طرح

درج بالا حقائق بطور حوالہ بہت عرق ریزی کے بعد سامنے نہیں آئے ہیں بلکہ معمولی سی تلاش و جستجو سے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اس لئے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پرکاش فکری ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے کلام کی دلپذیری کیلئے وہ تمام شعری محاسن رکھتے ہیں جن سے کسی شاعر کو اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہوتا ہے۔

منظر شہاب

نام	:	محمد یٰسین
قلمی نام	:	منظر شہاب
والد	:	مولانا سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری (مرحوم)
تاریخ پیدائش	:	۳۱ر مئی ۱۹۲۷ء
جائے پیدائش	:	شاہو بیگھہ، گیا
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو، فارسی)
ملازمت	:	پرنسپل کریم سٹی کالج، جمشید پور (ریٹائرڈ)
تصانیف	:	(۱) پیراہن جاں (شعری مجموعہ) ۔ ۱۹۸۹ء
	:	(۲) بیاں اپنا (مضامین)
تحقیقی کام	:	ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری نے تحقیقی مقالہ لکھا جس کا موضوع تھا ''منظر شہاب۔ حیات اور فکر و فن''
	:	ڈاکٹر انور مجیب (مگدھ یونیورسٹی) نے بھی تحقیقی مقالہ لکھا
پتہ	:	جمشید پور

منظر شہاب

اردو کی حسین اور صحت مند روایت کے نقیب کی حیثیت سے منظر شہاب کی تشخیص بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ترقی پسند کی بھی اپنی ایک روایت ہے۔اس تحریک کے علم برداروں میں ایسے لوگ بھی تھے جنکے یہاں نعرے بازی اور سیاست زدگی نہیں تھی۔منظر شہاب موخر الذکر ذہنی رویے کے پاسدار ہیں۔ترقی پسند ادب کے معماران جدیدیت کو اس کی توسیع کہتے ہیں ایسا کہنے کے پیچھے انکے اپنے استدلالی خیالات ہیں جسکی کاٹ ممکن ہے اور نہیں بھی۔ممکن اس لئے کہ جدیدیت تحریک نہیں بلکہ رجحان ہے اور کوئی رجحان سیاست کے تابع رہ کر ادب تخلیق نہیں کرتا۔اس کے اثبات کی بھی گنجائش ہے وہ اسطرح کہ ہندوستان میں اقدار کی بحالی میں صرف سیاست ہی کا براہ راست حصہ نہیں بلکہ اس کے لئے سماجی،تہذیبی اور جغرافیائی صورت حال بھی ادب کی نوعیت اور جہت کو متاثر کرتی ہے اس لحاظ سے جدیدیت کا معاملہ گذشتہ سے پیوستہ والا ہے۔ اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی ، مظہر امام، جاں نثار اختر،ظفر گورکھپوری کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جنکی شاعری میں آج بھی مضبوط سماجی سروکار موجود ہے۔ان حضرات کے یہاں فردیت سے پیدا شدہ سماجی بحران کے ساتھ ساتھ اپنا دکھ بھی مترشح نظر آتا ہے۔میں منظر شہاب کو بھی اس زمرے میں رکھنا پسند کرتا ہوں۔

فی الوقت میرے پیش نظر ان کا شعری مجموعہ ''پیراہن جاں'' ہے۔اس مجموعے کے نام کی بلاغت سے منظر شہاب کی ذہنی کیفیت اور زرخیزی کا پتہ چلتا ہے۔منظر شہاب نے بقلم خود مقدمے کی شکل میں اپنی شخصیت کے ادبی خدوخال کو مختلف زاویوں سے روشن کیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں ایماندارانہ ڈھنگ سے اپنے بارے میں سچ لکھنا آج سب سے مشکل کام ہے۔

منظر شہاب نے یہ کارِ دشوار بھی کر دکھایا ہے جو''خونچکاں قصہ مرا'' کے عنوان سے مرقوم ہے اسے ہم صرف سوانحی خاکہ نہیں کہہ سکتے۔اتنی عمدہ نثر دیکھنے کو آج بھی آنکھیں ترستی ہیں۔اپنی ادبی زندگی کا آغاز،سیاسی،تہذیبی صورتِ حال کا پس منظر اور پھر خود منظر شہاب کا اس کے اسباب وعمل کے ساتھ ذہنی اتصال بے حد سلیقگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے ان الفاظ میں نظریہ شاعری کا اظہار کر کے اپنے تئیں کسی قسم کی غلط بیانی پر تردید کا قفل لگا دیا ہے''یہ بھی حقیقت ہے کہ ہئیت کی تمام

ترحسن کاری کے باوجود ایسے موضوعات جو سماجی ارتقاء میں حارج ہوں، تخلیقی ادب کی سطح کو پست کردیتے ہیں ادب یا کسی فنِ لطیفہ میں ناوابستگی کا سوال بے معنی ہے فنکار کبھی معنی کبھی ہئیت اور کبھی دونوں سے وابستہ رہتا ہے" منظر شہاب کی محولہ رائے سے من وعن اتفاق کرتے ہوئے ان کی غزلیہ شاعری کا احتساب انھیں مضمرات کے حوالے سے پیش کرنا چاہوں گا جیسا کہ منظر شہاب نے اپنی اس کتاب کو" اردو شاعری کی حسین روایت کے نام" سے منسوب کیا ہے۔ اردو غزل کے اجمالی محاسن پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایسے اکابر شعراء جو گل وبلبل اور جنوں خرد کی تماشہ گری کرتے رہے ہیں ان کے یہاں ایسے اشعار خال خال ملتے ہیں جس میں موضوع خشک کو دلچسپ بنانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اس موقع پر مجھے فراق گورکھپوری کا یہ شعر ذہن کے خانے سے نکل کر نطق پر آرہا ہے

مجھ سے کیا ہوسکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

منظر شہاب نے اپنے اخلاقی جواز کو بھرپور نظم وضبط سے پیش کیا ہے

ناداریاں مری کہ تمھیں کچھ نہ دے سکا
تم نے تو خیر سونپ دی مجھ کو متاعِ غم

محولہ دونوں اشعار کو حوالے کے طور پر پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ منظر شہاب حسین روایات کے پاسدار ہیں اور روایتی شاعری کے حسن کی تجسیم کاری میں کسی اسمِ اعظم کے بالمقابل بہ آسانی رکھے جاسکتے ہیں۔ منظر شہاب کی اپنی شاعری کے سلسلے میں جو رائے ہے وہ انھیں کے شعر کی زبان میں یوں ہے۔

تیرے اشعار میں اعجاز تاثر ہے شہابؔ
رگِ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

شاعر اپنی شاعری کے سلسلے میں ''اعجاز تاثر'' کو فوقیت دینے پر اس لئے حق بہ جانب ہے کہ ان کے یہاں زمان و مکان کی عطا کردہ جتنی بھی اور جیسی بھی صورتِ حال ہے وہ شعر کے سانچے میں ڈھل کر فکری ڈھنگ سے مخاطبے کی ذمہ داری کا نباہ کرتی ہے۔ان کے انداز بیان میں کہیں مبالغہ آمیزی، تصنع اور خوش گمانی نظر نہیں آتی۔اس ضمن میں منظر شہاب کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

فریب کار سہی دل کا غمگسار تو تھا
وہ اک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح

دل مرا عقل پہ ایمان تو لایا ہے مگر
اس گنہگار کے ایمان سے جی ڈرتا ہے

لپٹ کے برہنہ شاخوں سے رو رہی ہے صبا
غریب کس سے کہے جامۂ بہار سلے

یوں بھی ہوا کہ ہجر میں تھے ساتھ ساتھ ہم
یوں بھی کہ ساتھ رہ کے بھی تنہا رہا کئے

''ہلو'' پہ میرے تبسم کا پردہ ڈال دیا
بڑھایا ہاتھ تو آداب کہہ کے ٹال دیا

کہیں پڑوس کا کوئی لہو پکار نہ لے
توقعات نے کیا کیا نہ اشتعال دیا

محولہ بالا اشعار میں اردو غزل کی حسین روایت کو فروغ دینے والے مضامین سلیقے سے نظم کئے گئے ہیں جس سے منظر شہاب کی پختہ کاری اور ''اعجاز تاثر'' کا انکشاف ہوتا ہے۔اس کتاب کی چند ایسی غزلیں میرے مطالعے میں آئی ہیں جو جدیدیت کے شروعاتی دور میں خواص کے یہاں رائج غزل تھیں یعنی موسم پیڑ، تکلم، شکستگی کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا جا رہا تھا۔منظر شہاب نے اس باب میں دلپذیر اشعار کہے ہیں

چاہے ہوا ہو کوئی موسم نہیں بدلتا
پیڑوں کا سہا سہا عالم نہیں بدلتا
ضرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہونگی
اداس آنکھ کا آنگن دُھلا دُھلا سا ہے
وہ بے زبان تکلم وہ بے صدا ترسیل
خموش رہ کے بھی سب کو کہا کہا سا ہے
اگر چہ دل کی کہانی سنی سنی ہے شہاب
مگر جناب کا لہجہ نیا نیا سا ہے
گماں تھا ہر کو تخاطب تھا بس اسی کی سمت
پہاڑی روپ کے ہر رنگ میں خطاب سا تھا
وہ سرد چاند جو بے نور تھا شبِ آخر
کبھی زمیں کے فلک پر وہ آفتاب سا تھا
پھر درد کی شاخوں میں نئے پھول ہیں روشن
پھر حوصلہ جینے کا ملا شہر ہوس میں
عظیم تر ہے محبت میں روح کا رشتہ
مگر بدن کا تعلق بھی درمیاں نکلا
نہ جانے کیسی عنایت کا پیش خیمہ ہے
پھر آج میرے لئے حرفِ مہر ہاں نکلا
سنی جو میری کہانی تو رو پڑے سب لوگ
سبھوں کے درد میں اک رشتۂ نہاں نکلا

درج شدہ اشعار کی تہہ میں اتر کر دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کے کلام میں تیزی سے تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تبدیلی فکری و استعاراتی نظام میں ہی نہیں بلکہ موضوعات کو برتنے میں اضافتی ترکیب کی جدّت طرازی میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسطرح منظر شہاب ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جنہیں زندگی کی سدا بہار قدروں پر کامل یقین ہے۔

سیّد احمد شمیم

نام	:	محمد شمیم احمد
قلمی نام	:	سیّد احمد شمیم
والد کا نام	:	مولانا سیّد محمد طٰہٰ الٰہی فکری (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سیّدہ سکینۃ الفاطمہ (مرحوم)
تاریخ پیدائش	:	۲/اگست ۱۹۳۹ء
جائے پیدائش	:	شاہو بیگھا، ضلع گیا حالیہ جہان آباد (بہار)
تعلیم	:	ایم۔اے
ادبی سفر کا آغاز	:	۱۹۵۸ء
تلمذ	:	بی۔زیڈ۔مائل (مرحوم)
تصانیف	:	بے در و دیوار۔شعری مجموعہ۔۲۰۰۰ء
	:	ارژنگ۔مجموعہ مضامین
		نزولِ شام۔شعری مجموعہ (زیرترتیب)
		مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔خاکے (زیرترتیب)
ملازمت	:	ریڈر شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور (ریٹائرڈ)
اعزازات	:	شلپی ایوارڈ، ہندی ساہتیہ سمّیلن۔جمشید پور ۱۹۹۷
		نشانِ سجاد ظہیر۔گولڈن جبلی انجمن ترقی پسند مصنفین۔۱۹۸٦
پتہ	:	روڈ نمبر ۱۸، جے۔کے ایس کالونی جواہر نگر۔جمشید پور

سید احمد شمیم

سید احمد شمیم شہرِ آہن جمشید پور کے ایک ایسے شاعر ہیں جنکے یہاں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے بیچ کسی قسم کا مغالطہ درپیش نہیں ہے قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں کسی طرح کا براہ راست اعلان بھی نہیں کیا کہ وہ کسی طرح کی ازم کے ساتھ کمٹمنٹ رکھتے ہیں۔ اب جب کہ سارا منظر صاف ہو چکا ہے ادب میں صالح نظریات کے ادیب وشاعر کا ہمیشہ سے یہ طرّہ امتیاز رہا ہے کہ وہ ادب کو صحت مند معاشرے کی تشکیل کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔ میں سید احمد شمیم کو ایسے ہی زمرے میں لاکر یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ سید احمد شمیم کے یہاں نظریات کی کشمکش شروع سے ہی نہیں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر براہ راست طور پر ترقی پسندیت سے متاثر ہونے کے باوجود نعرے بازی کی شاعری سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ سید احمد شمیم مانتے ہیں کہ زندگی کا جو خوبصورت چہرہ نظر آتا ہے وہ حقیقت میں بالکل ایسا نہیں ہے۔ زندگی مختلف نوعیّتوں کے المناک تماشے دکھاتی رہتی ہے۔ زندگی خوابوں میں اور دھندلکوں میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے وہاں بھی سید احمد شمیم ہراساں نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے اندر عزم اور مزید پختہ ہوکر جلوہ گر ہوتا ہے۔ غیر اعلانیہ طور پر انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ ادب کوئی جامد شئے نہیں ہے۔ اس کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے ادب کے فلک کو بہت وسیع کر کے دیکھا ہے جہاں چاند، سورج کے دمکتے وجود کے علاوہ بجھتے ستاروں اور روپوش ذیلی سیاروں کا قافلہ موجود ہے۔

ادب میں نئے نئے تجربے آغاز ادب سے ہی ہوتے آرہے ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر مضامین کے انتخاب اور کتابوں کی اشاعت نے قاری کو ہمیشہ متحیر کیا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں 'نئے نام' اور 'نئی نظمیں' کی اشاعت سے سید احمد شمیم کو تحریک ملی اور انھوں نے ۱۹۷۰ء میں شمس فریدی کے اشتراک سے 'گلوب' کے نام سے نئی شاعری کا ایک انتخاب شائع کیا جو ادبی حلقے میں موضوعِ سخن بنا رہا۔ اس انتخاب میں شامل تخلیقات نے اردو ادب میں کیا اضافے کیئے شاعری کا کون سا رجحان سامنے آیا۔ کیا یہ جدیدیت کی پیش قدمی تھی یا ماورائے جدیدیت سے مزین شاعری کی ایک نئی سمت تھی۔ ان پیچیدگیوں سے قطع نظر اس انتخاب کو دیکھا جائے تو یہ شعوری یا لاشعوری طور پر ادب کو اچھے قلمکاروں اور

نئے ٹرینڈ سے آشنا کرانے کی مثبت کوشش تھی جسکی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہئے تھی لیکن ادب شناسی کی اس مخلصانہ کوشش کو یکسر مسترد کر دیا گیا کہ اس سے کسی ایک چہرے کی وضاحت نہیں ہوتی۔ اس میں تو ہر قبیل کے شعراء اور ان کی تخلیقات شامل ہیں۔ ان میں سے بعض ترقی پسندیت کی تیز ہواؤں کا رُخ موڑنے کے درپے تھے تو کوئی اس کے ساتھ ساتھ بہت دور تک نکل آئے۔ کوئی انقلابی گھن گرج کے حامی بنے رہے تو کوئی جدیدیت کے دم ساز۔ اسطرح ایک گنجلک سی کیفیت کا عکس 'گلوب' میں شامل تھا۔ قاری کے لئے کسی ایک نتیجے پر پہنچنا دشوار گذار امر تھا۔ اس میں ن۔م۔ راشد، عادل منصوری، ساقی فاروقی، محمد علوی، منیر نیازی، حرمت الاکرام، ادیب سہیل، کرامت علی کرامت، بلراج کومل، جیلانی کامران، وحید الحسن و دیگر شعراء کرام کی شمولیت تھی میں سمجھتا ہوں کہ سید احمد شمیم نے اچھی تخلیق کی وکالت کی ہے کسی مخصوص نظریے کی نہیں۔ اس لئے وہ خود کو ایک اچھا تخلیق کار گردانتے ہیں رجحان ساز نہیں۔ وہ خود کو کسی خیمے میں رکھنا پسند نہیں کرتے۔ بس اچھی اور اثر آفرین شاعری و نثر تخلیق کرنے کو اپنی کامیابی مانتے ہیں۔ اب قاری پر منحصر ہے کہ وہ ان کی تخلیق کا کیا اثر قبول کرتے ہیں۔ اب ہم سید احمد شمیم کے یہاں معاملاتِ زندگی کو برتنے کے سلیقہ مند پہلو کی طرف آتے ہیں۔ اردو کی غزلیہ شاعری میں 'بے گھری' کا تصور عام ہے خصوصاً جدید غزل میں اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ جدید شاعر کا مقدر ہی ایسا ہے کہ اسے زمان و مکاں کی حصولیابی کے مرحلے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل کے شعراء کے یہاں 'بے گھری' کا تصور نہیں ہے۔ غالب نے جب کہا تھا

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

تو اس میں بھی گھر کی عدم موجودگی نہیں بلکہ بدصورتی منعکس ہوتی ہے لیکن سید احمد شمیم کے یہاں معاملہ کچھ الگ ہے گھر کے ساتھ شہر اور گاؤں کے بیچ جو رشتہ قائم کیا گیا ہے اسے شاعر نے بے پناہ تخلیقی جودت کے ساتھ اسے واضح کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے

تم شمیمؔ آئے ہو گاؤں سے بتاؤ کچھ
آج بھی مرے گھر کا بولتا ہے دروازہ

اس شعر سے سید احمد شمیمؔ کا اپنے گاؤں سے بے پناہ لگاؤ تو ظاہر ہوتا ہی ہے ساتھ ہی شاعر کے خیالوں کی دنیا میں آباد گاؤں کا فطری چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے یہ خالص نئی حسیت پر دار و مدار ہے کوئی شاعر اس نوع سے سوچے۔ سید احمد شمیمؔ 'دروازے کے بولنے' کا اظہار کر کے بالکل نئی طرح سے اپنی بات کہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سید احمد شمیم نے اپنی انا کے حوالے سے معصومانہ انداز میں بڑے پتے کی بات کہی ہے جس سے ان کی خود آ گاہی تو مترشح ہوتی ہی ہے ان کی مخصوص طبیعت کا مطالعہ بھی جھلکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انا ہی غیرت وحمیت کا پیمانہ ہے جب تک کسی شخص میں انا زندہ ہے زندگی پر اس بھاری بھرکم شخصیت کا رعب طاری رہتا ہے حالانکہ اس کے برتاؤ کے مدارج میں ناکوں چنے چبانے پڑتے ہیں لیکن احساسِ شعور اور مزاج کی بالیدگی سے یہ کریہہ صورت حال ڈھکی چھپی رہتی ہے اس لئے اس پس منظر میں سید احمد شمیم کا رول بالکل شاعرانہ ہو کر مجاہدانہ ہو گیا ہے ان کا ایک شعر دیکھئے

کچھ تو مری فطرت میں ہے مجبوری انا کی
کچھ ناز اٹھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے

دوسرے مصرع میں کچھ ناز اٹھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے کہہ کر شعر کے نازک آبگینے کو بڑے اہتمام سے ٹوٹنے سے بچالیا ہے۔ سید احمد شمیم کی غزلیہ شاعری سے نمونے کے طور پر بہترے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جس میں مظہر امام جیسی کیفیت سامنے آتی ہے

شام دہلیز پہ چپ چاپ کھڑی ہے میری
چاندنی یاد کی آنگن میں بچھامت دینا

شام کا دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا رہنا، یاد کی چاندنی کو آنگن میں نہیں بچھانے کی التجا کرنا، نفی میں بھی اثبات کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔

سید احمد شمیم درس وتدریس سے جڑے رہے ہیں ان میں ایک اچھے معلم کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں اس لئے ان کے شاگردان کی ایک اچھی خاصی تعداد رہی ہے وہ اپنے شاگردوں میں کافی عزیز اور مقبول رہے ہیں تبھی تو ان کی عزیز شاگردہ نزہت پروین صاحبہ (اسلم بدر کی بیگم) نے ان سے

اصرار کر مضامین کی کتاب 'ارژنگ' شائع کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ایک اچھا معلم وہی ہوتا ہے جو طلبا و طالبات کو مفید مشوروں سے نوازے، اُن کی مشکل ترین راہوں کو آسان اور ہموار کرے، گاہے بہ گاہے متنبہ کرے۔ یہی معلمانہ انداز ان کی شاعری میں جا بہ جا دیکھنے کو ملتی ہے۔ نظمیہ شاعری ہو یا غزلیہ مخاطب کو مشورے دینا، انھیں ایسے کام سے روکنا جسے وہ ناپسند کرتے ہوں یا اس کام میں بھلا نہ ہو، اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اُن کی شاعری میں دور اندیشی کی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں وہ مخاطب کو آنے والی مصیبتوں سے آگاہ کر رہے ہوں یا مشاہداتی کلمات سے اسے باخبر کر رہے ہوں۔ انھوں نے عمر کا ایک طویل سفر کاٹا ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز کو چھوتے ہوئے انھوں نے کئی دہائیاں گذاری ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فولاد آگ میں تپ کر کندن بن جاتی ہے۔ سید احمد شمیم بھی زمانے کی تیز اور جھلسا دینے والی دھوپ میں تپ کر ایسے مرد آہن بن گئے ہیں جن پر نہ تو موسم خزاں کی باد سموم اثر کرتی ہے نہ حالات کی پروائیوں کا زور۔ اس لئے وہ ہر فعل مشاہدے کی روشنی میں کرنے کے قائل ہیں اور ر جہاں انھیں اس سے ہٹ کر کوئی امر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے وہ خاموش نہیں رہتے بلکہ مخاطب کو متنبہ کر کے نیک مشوروں سے نوازتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے اور یہی فطرت اس شخص کی اندرونی کیفیت کا مظہر ہے یہی اسے بلند و پست کرتی ہے۔ کوئی شخص شور شرابے میں بھی سکون حاصل کر لیتا ہے اسے دنیا و مافیہا سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ کوئی شخص تنہائی میں بھی گھٹن محسوس کرتا ہے۔ عجیب مختلف المزاج ہے یہ دنیا۔ سید احمد شمیم بھی اپنی فطرت کے ہاتھوں خود کو بے بس و مجبور پاتے ہیں۔ ان سے کسی کی غلط روی یا تنزلی دیکھی نہیں جاتی اور وہ ایک بالغ ہوشمند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اسے بار آور کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

نظم 'بادباں کو نہ کھولو'

ہوا تیز ہے/ بادلوباں کو نہ کھولو/ یہ کشتی یوں ہی/ تیز چلتی رہی تو/ چٹانوں سے ٹکرا کے/ انجام کیا ہو/ نہ میں جانتا ہوں/ نہ تم جانتی ہو/ ہوا تیز ہے/ بادباں کو نہ کھولو۔

غزل کے چند اشعار

تمام کھیل ہوا دن ڈھلا چلو اب گھر
نزول شام ہے اور راستہ اکیلا ہے
شجر درد کا ہر پھول کھلا رہنے دو
دشتِ تنہائی میں ایک آبلہ پا رہنے دو

کیا خبر لوٹ کے کب آئے وہ جانے والا
دل کا دروازہ بھی بے خواب کھلا رہنے دو
تمہیں معلوم کیا نازک ہے کتنا درد کا رشتہ
اٹھا کے اس گلی سے یاد کا پتھر نہ لانا تھا
وہ قرب کیسا کہ دونوں وجود جل جائیں
دل ونگاہ میں اچھا ہے فاصلہ رکھنا

سید احمد شمیم مختلف الجہات شاعر ہیں۔ انھوں نے رومانیت سے لبریز اشعار کہے تو تصوّف کو بھی اپنا شعار بنایا جب سامراجیت کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا تو اشتراکیت کی مہر ثبت ہوتے ہوتے بچی ۔ جب اس سے اجتناب کیا تو جدیدیت اپنا پاؤں پھیلائے راستہ روکے کھڑی تھی۔ بڑی مشکل شعری سفر رہا ہے سید احمد شمیم کا۔ اشتراکیت کے دور جبر میں انھوں نے بھی سامراجیوں کے خلاف اپنا زور صرف کیا اور اتنی بلند بانگ صداؤں کا سہارا لیا کہ مخدوم محی الدین کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ مخدوم محی الدین کی شاعری سے متاثر رہے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ اشتراکیت آج بھی زندہ ہے اور دل کے نہاں خانوں میں پرورش پا رہی ہے۔ اشتراکیت سے متعلق خود ان کی رائے ہے کہ اشتراکیت ایک فلسفہ بھی ہے اور سائنس بھی۔ یہ محض اڑائی ہوئی ہوا ہے کہ اشتراکیت Dead ہوگئی۔ اشتراکی حکومتیں ضرور ناکام ہوئی ہیں مگر اشتراکیت کا جو نامیاتی اور جدلیاتی فلسفہ ہے اپنے اندر تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے، آج بھی رواں ہے"۔

اشتراکیت کا عنصر ماحول کا پروردہ تھا۔ اُن کے بھائی منظر شہاب خود اشتراکی رہے ہیں اس لئے اُن کی محفلوں میں جانے اور اشتراکی کتابوں کے مطالعے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اشتراکی نظریے کی حامل چند اشعار ملاحظہ ہو۔

لہو کا چیختا دریا دھیان میں رکھنا
کسی کی پیاس بجھی ہے نہ اوس پینے سے
وہ سانپ جسکو بہت دور دفن کر آئے
پلٹ نہ آئے کہیں وقت کے دفینے سے

سیدّ احمد شمیم کی شاعری میں حزنیہ رنگ ان کی اپنی زندگی کا عکس ہے۔نا مساعد حالات نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔سب سے بڑا دلدوز واقعہ جوان بیٹے کی نا گہانی موت تھا جس نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔انسان پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک دردو آلام کے سائے میں گذارتا ہے درد جب حد سے سوا ہو جاتا ہے تو مسکرانے کی ناکام کوششیں دل کے اندر بیٹھے غم کا مظہر ثابت ہوتی ہیں۔دلوں کے اندر درد کی یہ تہیں اتنی دبیز ہو جاتی ہیں کہ مسرت کی کوئی گرمی اسے پگھلانے سے قاصر رہتی ہیں۔چہروں پہ تبسم کی لکیروں کی جگہ غم واندوہ کی سیاہی پھیل جاتی ہے اور یہی سیّد احمد شمیم کی زندگی کا المیہ ہے انہوں نے کرب کو اپنے شعروں میں دانستہ سمونے کی کوشش نہیں کی ہے غیر دانستہ طور پر دردو کرب کا ایک جم غفیر سا جمع ہو گیا ہے۔چند اشعار اس حقیقت کے بیّن ثبوت ہیں کہ ان کی آنکھیں آج بھی اس غم میں چھلک پڑتی ہیں۔آنسوؤں کا قافلہ جب چل پڑتا ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتا۔

چھپا کر جنگلوں میں کھو گیا
شام کیا آئی پرندہ سو گیا
جا گتا دروازہ آنکھیں مونڈ لے
لوٹ کر آئے گا کیسے جو گیا
فضامیں اُڑتے پرندوں نے پر سمیٹ لئے
دلوں میں گونجتی یہ درد کی صدا کیوں ہے
خیالوں کا سمندر جاگتا ہے
مگر سینے کے اندر اک خلا ہے
دے کے مرے دل کو اس نے ایک درد بے اماں
میرا دامن جگمگا تے موتیوں سے بھر دیا
وحشت صحرا مجھے دے کر نوازا اس طرح
اک درودیوار سے آزاد مجھکو کر دیا

نظم ''صبح ہونے کے بعد'' شاعری کی پراسرار کیفیت کا اظہار یہ ہے۔شاعر ہمیشہ غموں کے بیچ سانس لیتا ہے اب تو غم کا ہیولا خوابوں میں بھی تعاقب کرتا ہے اس سے بچنے کی اب کوئی صورت نظر نہیں آتی

۔کہا جاتا ہے کہ نیند ساری تھکان مٹا دیتی ہے۔ نیند سے بیدار ہونے پر جی ہلکا ہوجاتا ہے طبیعت شاداب ہو جاتی ہے لیکن یہاں تو نیند خود غم کے تھپیڑوں میں پھنس کر ہانپتی معلوم پڑتی ہے ایسے میں تفریح طبع کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

شاعر خود کو جب بے بس و مجبور پاتا ہے تو رومانی شاعری کی اپنی عافیت کا وسیلہ بناتا ہے کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ اپنے غم غلط کرنے کی خاطر انھوں نے عشقیہ شعر کہنے شروع کیئے تاکہ ذہن کی فرسودگی عشق کی رومانی چاشنی میں تحلیل ہو کر زندگی کے نشاط آگیں لمحات سے ہمکنار ہو سکے۔ انسان اپنے غموں کو بھولنے کی خاطر طرح طرح کے حربے اختیار کرتا ہے کوئی منشیات کا استعمال کرتا ہے تو کوئی شراب نوشی اور کوئی اپنی ذات کو اتنا ہلکان کر لیتا ہے کہ جزوقتی مسرت اسے بہلا وادے کر نیند کی آغوش میں سلا دیتی ہے۔ سیّد احمد شمیم نے وہی کیا جو شاعری میں جائز ہے۔ غالب، میر آتش، ذوق سے لے کر فراق، جگر و دیگر معروف شعراء نے بھی صنف نازک کی شان میں پورے دفتر اکٹھے کر دیئے ہیں۔ غالب نے تو اعتراف کر لیا کہ

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میرؔ نے تو اپنے محبوب کے سراپا اور اجزائے جسمانی کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان ایک کر دیا۔

نازکی ان کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

فراقؔ کی شاعری تو ہجر و وصال کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

اک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ
ترے جمال کی دوشیز گی نکھر آئی
یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

محولہ معتبر شعراء کے حوالے اس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ معاملات عشق میں سیّد احمد شمیمؔ کا بھی اپنا ایک طریقۂ کار ہے سیّد احمد شمیمؔ کی عشقیہ شاعری ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ بھرپور معنویت رکھتی ہے۔ اسلوب بیان بالکل سادہ اور الفاظ کے ترکیب و استعمال میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ طریقۂ اظہار غالب کے مکتوب کی طرح ہے گویا مخاطب سے بات ہو رہی ہے 'مجھے بکھرنے سے روک لینا' بڑی پیاری نظم ہے پیش کرتا ہوں۔

تمہارے عارض کے آئینے پر/شفق کی سرخی/بکھر رہی ہے/دراز پلکوں کے میکدے سے/مئے شبانہ چھلک رہی ہے/ہوائے گیسوئے سنبلیں میں/سہاگ خوشبو بسی ہوئی ہے/تمھارے قدموں کا لمس پا کر/یہ رہگذر بھی چمن چمن ہے/سراپا قوس قزح/تمہارا حسیں بدن ہے/بدن کو اپنے سمیٹ لینا/مجھے بکھرنے سے روک لینا۔ یہاں شاعر نے محبوب کی تعریف بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے اور اس کے حسین جسم جو دلکش اور مسرت آمیز ہے اس کے سراپے میں اپنا غم بھول جانا چاہتا ہے اور خود کو بوالہوسی سے بچائے رکھنے کی خاطر اسے اپنے بدن کو سمیٹنے کا مشورہ بھی دیتا ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور نظم ''ذائقہ ماورائے بدن'' جو سیّد احمد شمیمؔ کی جنسی شاعری سے متعلق سبھی شکوک کے دائرے کو توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ نظم یوں ہے۔

بدن ایک ایسی/حقیقت ہے جس سے/اگر کوئی انکار کرنا بھی چاہے/تو ممکن نہیں ہے/بدن کو ازل سے/بدن کی ضرورت رہی ہے/مگر ماورائے بدن/اور بھی ایسی سچائیاں ہیں/کہ جن میں/لطافت ہے/لذّت ہے/اور حسن ہے/تو پھر کیوں نہ ہم بھی/حصار بدن سے نکل کر/ماورائے بدن بھی/نئے ذائقوں کی تمنا کریں واقعی اس دور عریانیت میں بدن کی پاکیزگی کا احترام تزکیۂ نفس ہی تو ہے جبکہ شاعر بدن کی لذّت سے آشنا ہے کہا جاتا ہے کہ جہانگیر اس وقت تک دربار کی کاروائی شروع نہیں کرتا تھا جب تک کہ نور جہاں کا لمس اسے میسّر نہیں ہو جاتا۔ انتہا ہی بدن کی جستجو ہے۔ اب

تو بدنی لمس کے لیئے دو چار ملاقات ہی کافی ہیں۔ دل کی اضطرابی کیفیت کا زور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ برجستہ کہہ دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا جاتا

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

سیّد منظر امام، سیّد احمد شمیم کے یار غار مانے جاتے ہیں وہ سیّد احمد شمیم کے عشق کی گتھی سلجھانے سے قاصر ہیں۔ انہیں اس بات کا دکھ بھی ہے کہ احمد شمیم نے اس راز کو ان سے کیسے چھپائے رکھا۔ وہ کون ماہ پری ہے جس نے شمیم کے اعصاب پر سحر کر دیا۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ عورت میں وہ پوری کائنات کو دیکھتا ہے یا کائنات یا مناظر قدرت کو عورت تصوّر کر لیتا ہے"۔

ان تمام تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کوئی نہیں جسکو احمد شمیم کبھی چاند، کبھی پھول، کبھی قوس قزح، کبھی آئینہ اور کبھی مریم صفت صورت تصور کرتے ہیں بلکہ ان کا اپنا ذاتی کرب ہے جسکا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اسے کسی حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسے کبھی عورت کی موہنی صورت میں پاتے ہیں کبھی چاند میں، کبھی قوس قزح کے روپ میں اور کبھی فطرت کے ہر مناظر میں جسے وہ حسین استعارے کی شکل دینا چاہتے ہیں وہ ابدی خوشی کی تلاش میں اپنے غم کو بھولنے کی سعیٔ لا حاصل میں سر گرداں ہیں۔

ملتی ہے اس کے لمس میں اب گرمیٔ خلوص
شاید شمیم موم میں پتھر بدل گیا
میں کھلا حرف تھا لیکن یہ مقدر کہ شمیم

مجھکو سمجھا گیا پیچیدہ کتابوں کی طرح

سیّد احمد شمیم کی شاعری میں جہاں جمالیات کا رنگ گہرا ہے وہیں تصوّف کی چادر بھی کم دبیز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حالات زندگی کی بھر پور نمائندگی کی ہے۔ زمانے کی کسمپرسی کا عالم یہ ہے کہ ایک باپ وقت کے سورج کو اپنے تنگہائے دامن میں سمیٹنے سے قاصر ہے نہ اسے اولاد کی کھلکھلاتی صورت نصیب ہے نہ بیوی کی کسمساتی ہوئی خواہشوں کے تقاضے کی تکمیل کی فرصت ہی حاصل ہے

اس مشینی دور میں وہ بھی مشین ہوگیا ہے۔ پیٹ کی بھوک کی آگ سبھی تقاضوں کو سرد کردینے پر قدرت رکھتی ہے۔ان کی پیاری نظم مہمان میں اسکی وضاحت کی گئی ہے۔اس نظریے کا ایک شعر دیکھئے

آئینہ لے کے ہاتھ میں رونے لگے شمیمؔ
ملنے کو اپنے آپ سے اب جی ترس گیا

سیّد احمد شمیمؔ کی غزلوں کے بیشتر اشعار کو معنوی لحاظ سے جو مرکزیت حاصل ہے وہ دوسرے شعراء میں خال خال دیکھنے کو ملتی ہے۔غزلیات کے مطالعے سے ان کی فکری جہت اور تعمیری ذہن کا پتہ چلتا ہے ان کے یہاں احساس کی ایک ایسی سچائی جلوہ گر ہے جو ان کی شاعری کو دوام بخشتی ہے۔ درج ذیل اشعار کے مطالعے سے ان کی فکری جہت کو سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنا آسان ہو سکتا ہے۔

تم شمیمؔ آئے ہوگاؤں سے بتاؤ کچھ
آج بھی مرے گھر کا بولتا ہے دروازہ
سورج چڑھا تو اپنوں کی پہچان ہوگئی
سایہ بھی اپنا پاؤں کے نیچے سمٹ گیا
پلٹ کے رکھ دیا جب کاسۂ طلب اپنا
تو پھر دعا سے غرض ہے نہ مدعا سے ہے
شام دہلیز پہ چپ چاپ کھڑی ہے مری
چاندنی یاد کی آنگن میں بچھا مت دینا
کچھ تو میری فطرت میں ہے مجبوری انا کی
کچھ ناز اٹھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے
شیشہ تھا میں تو سنگ ملامت کی زد پہ تھا
پتھر بنا تو شہر کا منظر بدل گیا
میں کہ سویا ہوا خاموش سمند رتھا اگر
تم تو مہتاب تھے طوفان اٹھا دینا تھا

سیّد احمد شمیمؔ کی شاعری کے بارے میں مظہر امام کا خیال ہے کہ وہ نظموں کے شاعر ہیں۔ ندا فاضلی اور علیم اللہ حالیؔ کی آرا میں وہ غزل کے شاعر ہیں۔ نظموں اور غزلوں دونوں میں ان کی شاعری کا چہرہ صاف ہے اس لئے کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا بڑا مشکل امر ہے۔ میں تو انہیں ایک اہم پاکیزہ اور مختلف الجہات کا شاعر مانتا ہوں۔ سب سے بڑی بات ہے کہ سیّد احمد شمیمؔ نے اپنی شاعری کے اسلوب و پیکر تراشی کو خدا کے نام کر دیا۔ ان کا ایمان ہے کہ ان کے تصوّر نے ان کی شاعری کو دوام بخشا ہے جو کہ ساری کائنات کا خالق ہے۔ آج جبکہ انسان کسی عمل و شعور کے ذریعہ کوئی ترمیم و تنسیخ کے بعد اخذ کئے گئے نتیجے کو اپنی ایجاد مانتا ہے اور خود کو موجد کہلانے پر فخر کرتا ہے لیکن سید احمد شمیمؔ نے اپنے اسلوب کو کبھی اپنی اپج نہیں مانا بلکہ یہ بھی خدا کی دین تصوّر کیا۔ یہ امر سید احمد شمیمؔ کے ذاتی تصنّع سے بالاتر ہے اور غرور سے پرے ہے۔

ہاں وہ میرا کون ہے جس کے تصوّر نے شمیمؔ
تازگی اسلوب کو، الفاظ کو پیکر دیا
حروف وصوت کو، اعراب کوتا بندگی بخشی
فضائے شاعری کو کہکشاں جلوے دیئے کس نے

سید احمد شمیمؔ کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یعنی اسے ایک دہے سے بھی کم کی مدّت کہی جا سکتی ہے "بے در و دیوار" کا شعری تلازمہ شاعر کی بالغ ذہنی کا مظہر ہے۔ زمان و مکان میں مکان کی اہمیت مسلم ہے۔ سر چھپانے کیلئے چادر عافیت کی ضرورت ہر شخص کو ہے۔ روٹی کپڑا مکان کی فراہمی کے بعد زمانہ سازی کے لئے کوششیں ثمر آور ثابت ہوتی ہیں۔ "بے در و دیوار" ان کے معاصرین کے علاوہ نئی نسل کے تازہ کار اذہان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان مضامین کی حیثیت سے قطع نظر میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ سید احمد شمیمؔ جھارکھنڈ کے مستند غزل گو ہیں۔ یہ دعویٰ محض انکشاف کے لئے نہیں بلکہ 'بے در و دیوار' میں برتے گئے موضوعات کی روشنی میں مربوط کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان کی شاعری میں محرومی کی کیفیت نے 'بے در و دیوار' کی مجموعی حیثیت کو حصار میں باندھ کر رکھا ہے۔ یہ محرومی اپنی ذات سے وابستہ ہو کر معاملات زندگی سے منسلک ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ رشتوں کے زوال کا اظہار ہو یا پھر اپنی کم مائیگی کا احساس سبھی جگہ محرومی نے اپنا نمایاں رول انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار میرے اس دعوے کے خانے میں فٹ کئے جا سکتے ہیں۔

وہ تعلق کہ نفی کا نہ کچھ اثبات کا رنگ
اس سے توڑا نہ گیا مجھ سے بھلایا نہ گیا
پھول سے دل آنگن میں اپنے اترا تھا ایک چاند شمیم
شہر شہر قریہ قریہ پھر گڑھے گئے افسانے سب
تمہیں معلوم کیا نازک ہے کتنا درد کا رشتہ
اٹھا کے اس گلی سے یاد کا پتھر نہ لانا تھا
چاند چھونے کی تمنّا میں تہہ خاک ہوئے
اب کوئی خواب نہ پلکوں پہ سجایا جائے
تمام عمر اسی آرزو میں بیت گئی
وہ میرا ہے تو کبھی مجھکو میرا اپنا لگے

محولہ بالا اشعار میں رشتوں کی شکست وریخت، اس کے بحال ہونے کی پھر معصوم سی خواہش، رشتۂ درد کا یاد کے پتھر سے علاقہ جوڑنے کا ہنر سید احمد شمیم کے مخصوص عرض ہنر کا اشاریہ پیش کرتے ہیں۔ سید احمد شمیم کے یہاں محرومی کے علاوہ ایک اور شدید کرب ناکی کا مظاہرہ ہوا ہے۔ جدید شاعری میں ایسے تعلق کے اثبات ونفی کے بیچ سے پیدا شدہ کشمکش کی کیفیت سمجھی جاتی ہے۔ سید احمد شمیم نے اس رویے کو بہت گمبھیر ہو کر شعریت کا لباس عطا کیا ہے۔

سورج چڑھا تو اپنوں کی پہچان کھوگئی
سایہ بھی اپنے پاؤں کے نیچے سمٹ گیا
آئینہ لے کے ہاتھ میں رونے لگے شمیم
ملنے کو اپنے آپ سے اب جی ترس گیا

محولہ اشعار کی تہہ میں اترنے سے پتہ چلتا ہے کہ جدیدیت میں بے رشتگی کو غالب رویّہ قرار دیا گیا تھا اسے سید احمد شمیم نے بطور فیشن زدگی اختیار نہیں کیا ہے۔ ہر شعر میں ان کا اپنا دکھ ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک باشعور اور تخلیقی شاعر سے اسی معیار کی توقع کی جاسکتی ہے۔

رونق شہری

قلمی نام	:	رونق شہری
نام	:	عبدالغفار خاں
والدین	:	شہیرالدین خاں رسکینہ خاتون
اہلیہ	:	ناظمہ خاتون
اولادیں	:	شہناز، ماہ نور، بشریٰ ناز، رضوان صادقہ، زینت، اشرفیہ، فرحان
تاریخ ولادت	:	۲۶/اپریل ۱۹۵۲ء
جائے ولادت	:	جھریا چوتھائی کلہی، دھنباد، جھارکھنڈ
تعلیم	:	بی کام، بی اے، ایم۔اے، بی ایڈ (پی۔ایچ۔ڈی، جاری)
وطن	:	پنچان پور، ضلع گیا، بہار
ملازمت	:	آر۔ایس۔پی کالج جھریا میں بحیثیت اردو لکچرار (سات برسوں تک)
		کے سی گرلز ہائی اسکول میں بحیثیت انگریزی استاد (جاری)
تصانیف	:	کالی دھرتی کی غزلیں (مشترکہ شعری مجموعہ)
		سبز آتش۔(شعری مجموعہ) ۲۰۰۵
حال مقام	:	چوتھائی کلہی، جھریا دھنباد، جھارکھنڈ

رونق شہری

غیر منقسم بہار میں جب اردو شعری ادب پٹنہ اور رانچی کی کھلی فضاؤں میں پروان چڑھ رہا تھا تب دھنباد کی سنگلاخ زمین سے شعروادب کا ایک خوشنما پودا نمودار ہوا جو بہت جلد تناور شجر بن کر دنیائے شاعری پر چھا گیا۔اس کا نام نامی رونق شہری ہے جو ابتدا میں رونق گیاوی کے نام سے صفحہ قرطاس پر بکھرا رہا۔رونق شہری نے اپنی مشق ومزاولت سے شعری پیکر اظہار اور فلکِ تخیل کو اتنا وسیع ودراز کیا کہ الفاظ مُعانی ان کے قلم بوسی کرتے نظر آتے ہیں۔اُن کی شاعری داخلیت اور خارجیت دونوں کا حسین امتزاج ہے۔اُن کے شعروں میں جو ذاتی کرب ہے وہ عوام الناس کے روز مرّہ کے حالات کا آئینہ ہے شخصیتیں اپنے ماحول اور گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ گھر کا رکھ رکھاؤ،افراد کے ساتھ Treatment کسی کی زندگی سنوارنے اور بگاڑنے کی ضمانت ہوتا ہے۔بقول غالب

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

رونق شہری کے آباواجداد جس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہاں سپہ گری کا پیشہ مرغوب تھا۔رونق شہری کے ساتھ کم وبیش ایسا ہی ہے۔یہ اُس خاندان کے چشم وچراغ ہیں جہاں تلواریں درختوں میں برہنہ لٹکی رہتی تھیں اور کسی نے سر اٹھا کر بری نظر سے دیکھا تو اس کا سر قلم کردیا جاتا تھا۔پورے علاقے پر ان کے جدامجد کا رعب تھا۔اُن کی والدہ اتنی ہی معمر،شفیق،مہربان اور ذہین عورت تسلیم کی جاتی ہیں کہ پورے قصبے میں جہاں سے ان کا گذر ہوا لوگ احتراماً کھڑے ہوکر آداب بجالاتے ہیں۔ان کی پرورش متضاد صفتوں کے اشتراکی ماحول میں ہوئی جن کا تانہ بانہ رونق شہری کی شاعری میں بھی اجاگر ہے۔اس لئے ان کے یہاں شعری پیکر اظہار میں جہاں بڑی سادگی اور سلیقگی کا عنصر پایا جاتا ہے وہیں جارحانہ رویہ بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔انھوں نے مقامی طور پر ابھرنے والی ادبی چپقلش کو نظر انداز کرتے ہوئے سارا زور تخلیقی شاعری پر صرف کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے معتبر جدید شعراء

میں ان کا شمار ہونے لگا۔ شب خون، تحریک، شاعر، آجکل، جواز جیسے معتبر رسالے میں رونق گیاوی کے نام سے شائع ہوکر خاصے مقبول ہو گئے۔ رونق شہری کا مزاج انھیں ادب کی چوٹی پر پہنچانے میں معاون رہا ہے۔ رونق شہری نے ادب کے میدان میں جس ہمہ گیریت کے ساتھ اپنے پاؤں جمائے وہ پھر کبھی اُکھڑ نہ سکے انھوں نے ادب تخلیق کرتے وقت زندگی کی کرخت سچائیوں اور اپنے مشاہدات کا شدّت سے مظاہرہ کیا۔ مخالفین کے زورِ قلم کا انھیں اندازہ تھا اس لئے کبھی ان کے منہ لگ کر اپنے طرز احساس کو کمزور نہیں پڑنے دیا بلکہ ایک الگ راہ اختیار کر اپنی انفرادیت قائم کر دی۔ بقول فرحت قادری جن الفاظ کو چھوتے ہوئے ان کے معاصرین ڈرتے تھے رونق شہری نے انھیں ادب بدر الفاظ کو اپنی تخلیقی قوت سے رائج الوقت سکّے کی طرح جاری وساری کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شعروادب اور تجارت میں شہرت کا بڑا دخل ہے۔ رونق گیاوی کے وصف وہُنر سے جدید غزل کی جسطرح آبیاری کی اوراس کے نتیجے میں جو شُہرت حاصل ہوئی اسی پر اکتفانہ کر کے اپنے نام گیاوی کی جگہ ''شہری'' کا لاحقہ جوڑنے کا جوکھم بھی بغیر کسی اعلان کے ساتھ اٹھالیا۔ بہتوں نے یہ سمجھا کہ گاؤں کی ضد شہر سے 'شہری' لکھنے لگے ہیں لیکن واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ دو دہے تک اپنے وطنِ عزیز پنچان پور گیا سے قلبی لگاؤ ہونے کے باوجود انھوں نے لہو کے رشتے کو ہی مقدم سمجھتے ہوئے اپنے والد محترم شہرالدین خاں کے نام سے وابستگی کو لفظ ''شہری'' سے متصل کر کے اچانک رونق شہری کے نام سے لکھنا شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ رونق شہری دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں بھاشاؤں پر عبور حاصل ہے۔ یہ غزل کے علاوہ دو ہے، نوگیت، سا یئنٹ، قطعات بھی کثرت سے لکھتے رہے ہیں۔ بقول حسین الحق رونق شہری ندافاضلی کے معیار کا گیت لکھتے ہیں۔ ان دنوں یہ تنقید کیطرف مائل ہوئے ہیں۔ بشیر بدر، مظہرامام، غلام مرتضٰی راہی، صدیق مجیبی پر لکھے گئے مضامین ان کی تنقیدی صلاحیت کو منعکس کرتے ہیں۔ تبصرہ نگاری میں انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ کتاب کے حوالے سے اشعار کی نفسیات سے گرہ کھولنے کا ہُنر رونق شہری کو منفرد بناتا ہے۔

رونق شہری کا اپنے آبائی وطن ''پنچان پور'' سے جتنا لگاؤ ہے اس سے کہیں زیادہ سرزمین جھریا سے محبت وانسیت ہے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے دونوں مقاموں کا ذکر خیر کیا ہے۔ دونوں علاقے آب وہوا اور جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جھریا جو جھارکھنڈ ریاست کا مالدار

علاقہ ہے یہاں کوئلے کی کانیں ہیں جو پوری دنیا میں اچھے کوئلے پیدا کرنے کے لیئے مشہور ہیں۔ گرد آلود آب و ہوا جس کا ماحول چہار جانب موجود ہے۔ موت کے کنویں میں مزدوروں کا اترنا ظلمت زدہ سرنگوں سے میلوں کا سفر طے کرنا، کوئلے کاٹنا، پسینے سے شرابور جسم چور اور پھر کوئلے کی گاڑھی پرت کا جمع ہونا دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ اصل چہرے کا اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک کہ قاعدے سے غسل نہ کرلیا جائے۔ ایسے حالات میں جب سرنگیں بند ہو جاتی ہیں یا کہیں سے کوئلے کی چٹانیں سر پہ آجاتی ہیں یا کانوں میں پانی بھر جاتا ہے تو پھر کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا۔ موت اپنا کام کر جاتی ہے۔ وارثین اپنے رشتہ دار مزدور کا چہرہ بھی پہچان نہیں پاتے۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کی خاطر یہاں موت کا خطرناک کھیل روزانہ کھیلا جاتا ہے۔ ایسے ہولناک حوادث سے رونق شہری ہمیشہ آشنا رہے ہیں۔ مزدوروں کی مشقت بھری زندگی اور مافیا گروہوں کا ان پر کستا ہوا شکنجہ قابل ترحم ہوتا ہے۔ رونق شہری نے تو ان ماحولیات کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے کیونکہ وہ ایک طویل مدت تک کوئلے کی صنعت سے جڑے رہے ہیں۔ رونق شہری جھریا میں جہاں مقیم ہیں وہ کوئلے کی خرید و فروخت کی بہت بڑی منڈی کہلاتی ہے۔ وہاں روزانہ چار بجے صبح سے ۶ بجے تک یعنی دو گھنٹے میں کروڑوں روپے کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی سیاسی سرگرمیاں کوئلے کی حدت کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پر مذہبی لاابالی بھی شباب پر نہیں آتی۔ ان سبھی حالات کو رونق شہری اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور حسّی فکر و نظر سے تولتے پرکھتے بھی ہیں۔

تمام شہر میں ایندھن کی طرح جل کر بھی
ہے چہرہ کون ساد ھنباد کا پتہ نہ چلا
سر پر جون کا سورج پاؤں کے نیچے آتش
ایسی دوزخ کہیں نہیں جھریا سے آگے
خواہش کی چنگاری سرد نہیں ہو سکتی
آج تلک ہم پتھر زندہ کاٹ رہے ہیں
رہ گئیں بے نور آنکھیں راہ تکنے کے لیئے
چیخ اب تک گونجتی ہے کوئلے کی کان میں
یہاں پھیلی ہوئی چاروں طرف اک سبز آتش ہے
ہمارے شہر میں تم خاکِ ویرانی نہ پاؤ گے

رونق شہری جب ایک ہی طرح کے ماحول کی یکسانیت سے گھبرا جاتے ہیں تو تازہ دم ہونے کی خاطر اپنے آبائی وطن پنچاپور کا رخ کر لیتے ہیں۔ پنچاپور ضلع گیا کا ایک دلفریب اور رومان پرور دیہی علاقہ ہے جسے پہاڑوں نے اپنی گود میں بٹھا رکھا ہے ندیوں میں پانی کی اچھل کود مضطرب قلب کے لیئے سکون کا سامان فراہم کرتی ہے۔ رونق شہری ان مناظر سے لطف اندوز ہو کر خامہ سرائی کرتے ہیں۔

پانیوں میں ریت سورج بن گئی
ٹھنڈی ٹھنڈی مچھلیاں جلنے لگیں
سانحہ یہ ہے چھوا اس کو نہیں
اور ہماری انگلیاں جلنے لگیں
تو نہائے اگر من کے تالاب میں
اُس میں پیلی ہری مچھلیاں چھوڑ دوں
سڑک سے جُڑنے کی کوشش میں کٹ گیا خود سے
نہیں رہا وہی پنچان پور جیسا تھا

رونق شہری کی شاعری میں جو تحیر انگیزی ہے وہ عمیق مشاہدے کی ترجمان ہے انھوں نے حالات کے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات کو اپنے احساسات کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے شعروں میں جو کرب سمیٹا ہے وہ خود اُن کا بیتا ہوا کل ہے۔ ابتدا سے ہی انھوں نے زندگی کی کریہہ صورت کو خوشنما و شاداب کرنے کی خاطر خون جگر پلایا ہے انہوں نے عمر کی اس منزل پر آنے کے بعد بھی اپنی گرمئی احساس کو سرد نہیں ہونے دیا کوئی شخص جب تمام عمر کسی مقصد کی حصولیابی کے لئے جد و جہد کرتا ہے اور اس کی محنت صفر ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی بے معنی سی ہو جاتی ہے اسے اپنے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے وہ خود کو تھکا ہوا شکست خوردہ اسپ کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔ ان کیفیات سے گذرنے کے باوجود رونق شہری میں جو حلاوت اور دم خم ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ انھوں نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی بلکہ اُس سے آگے بڑھکر مصافحہ کیا۔ اُس کے غیر متوقع تیور سے بھی جینے کی راہ ہموار کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں احساسات کی جو صداقت ملتی ہے وہ کم ہی شعراء کا طرۂ امتیاز رہا ہے

مہرباں ہو کر کبھی زخموں کے ٹانکے کاٹنا
سنگدل ہو کر کبھی گردے کا پتھر دیکھنا

اوپر گھاؤ بدن کے ٹھیک ہو جائیں تو
چاقو سینے کے اندر لے جائے گا

مرغی ماں چیلوں سے جھگڑا کیا کرتی
چوزے کی آنکھوں میں اجگر بیٹھے تھے

شیر جنگل میں ہے دہشت میں مگر آبادی
مختصر بات بھی رکھتی ہے طوالت کتنی

اردو شعری ادب شروع سے ہی ناساز گار صورتِ حال کا مظہر ہے۔ حالات بدلے تو شاعری کا مزاج بھی بدلا۔ کبھی یہ ہندوی روایت سے مبسوط و مربوط ہوئی تو کبھی فارسی آمیز لہجہ اس پر غالب ہوا۔ عشق وحُسن سے جب اس نے دامن چھڑایا تو ترقی پسندانہ رویہ اس پر حاوی ہو گیا۔ اس کے بعد جدید دور کا آغاز ہوا۔ پھر مابعد جدیدیت سر ابھارنے لگا۔ ایک تخلیق کار جس نے شعر و ادب میں کئی تبدیلیاں دیکھی ہوں اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا کافی دشوار کن امر ہے کہ وہ خود کو کس خانے میں رکھے لیکن رونق شہری نے ایسے حالات میں خود کو ثابت قدم رکھا جبکہ انھوں نے ادب کی کئی بہاریں اور تحریکیں دیکھی ہیں۔ انھوں نے اپنے لہجے اور طرز احساس سے کبھی انحراف نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ دور سے ہی رونق شہری کو پہچانا جا سکتا ہے۔ انھوں نے شاعری میں نئی تراکیب ایجاد کی ہیں۔ روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے اُن کے زندہ عناصر کو اپنی شاعری میں نئے ڈھنگ سے باندھا ہے جو جدید غزل کی شان بن کر ابھرے۔ مرجھائے ہوئے پھول کا ذکر مختلف شعراء کے یہاں داغِ مفارقت، غم اور جُدائی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ احمد فراز گویا ہوئے کہ

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے سوکھے ہوئے کچھ پھول کتابوں میں ملیں

لیکن رونق شہری نے مرجھائے ہوئے پھول سے خوفِ خدا کی بات کہہ کر اپنی فکری دبازت اور ترکیب

الفاظ و معنی کو روشن زندگی عطا کر دی ہے۔

میں نے مرجھائے ہوئے پھول کہیں دیکھے تھے

ذہن میں تب سے مرے خوفِ خدا زندہ ہے

کچھ ایسے عام الفاظ ہیں جنکے حوالے کے بغیر شاعری ناممکن ہے جیسے زندگی، پھول، پتھر، ندی، دھوپ، سورج، چاند، چاندنی وغیرہ۔ شام کے حوالے سے بشیر بدر کا یہ شعر کتنا عامیانہ سا ہے کہ

مجھکو شام بتادیتی ہے

تم کیسے کپڑے پہنے ہو

رونق شہری نے شام کے حوالے سے زندگی کی کربناک تصویر پیش کی ہے

بیٹھے بیٹھے آگ لگانے کی ترکیب

روز بتادیتی ہے مجھکو آکر شام

اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہر شاعر اپنی ادبی بصیرت کے اعتبار سے شعر کہتا ہے لیکن اس میں جب تک زمان و مکان کا صحیح ادراک نہ ہو شعر تہہ داری سے خالی رہتا ہے۔ رونق شہری شعر کو بلند کرنے کے لئے شعوری کوشش نہیں کرتے ہیں مذکورہ شعر بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ شعر بشیر بدر کے شعر کے تقابل میں نئے تناظر کے مطالعے کا متقاضی ہے۔

۲۰۰۵ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''سبز آتش'' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے کی روشنی میں رونق شہری کو دریافت کرنے میں سب سے زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ بقول فاروقی رونق شہری نئی غزل کی زمین کی تلاش میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ اول تو اردو غزل میں دہرانے کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے دوئم نئی زمین کی تلاش کا عمل بھی ساکت ہو کر رہ گیا ہے ایسے میں رونق شہری کا نئی زمین کی تلاش میں دور دور تک نکل جانا اور بغیر گمرہی کے شکار ہوئے اپنے محور پر لوٹ آنا معمولی بات نہیں ہے۔ اردو غزل کا المیہ یہ ہے کہ ہر وہ شاعر جس کے پاس اپنی زمینی

طبیعت ہے اسے سر کنے دینا نہیں چاہتا۔ رونق شہری یہ رسک اٹھا کر لطف اندوز ہونے کا جواز فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل میں نئی امیجری کے سلسلے میں جو بات کہی ہے وہ بھی حق ہے۔ گردوپیش کی زندگی جو شعر کیلئے بنجر زمین کی حیثیت رکھتی ہے اس سے اپنی ذکی الحسی کے سارے ربط وضبط پیدا کر کے بھر پور شعری فضا خلق کرنا رونق شہری کی طبیعت کا خاصہ ہے جدید غزل کے بنیاد گذار شعرا میں مصور سبزواری کا نام آتا ہے مرحوم نے جس مثبت انداز میں رونق شہری کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے وہ بذات خود ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصور سبزواری کی شاعرانہ طبیعت سے جو لوگ آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں اتنا کھل کر بہت کم شعراء کے لئے انھوں نے کلماتِ بلیغ استعمال کئے ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے جو شعر درج کیا ہے وہ خود مصور سبزواری کی طبیعت سے میل کھاتا ہے۔

تمام پیڑ تھے جنگل کے نذرِ ظلمتِ شب

جبینِ کوہ پہ کچھ نور نور جیسا تھا

شاعر کے مشاہدے کی عمیق گہرائی کو پیش کرنے والا یہ شعر مختلف الجہات ہے۔ اس شعر کا پسِ منظر اور پیش منظر دونوں کے اتصال سے شعر کا فلک روشن ہو گیا ہے۔ خوش سماعت حروف کے تئیں رغبت کا انکشاف سب سے پہلے مصور سبزواری نے ہی کیا ہے جبکہ اس رویّے کے خلاف علیم اللہ حالی نے ''کھردرے الفاظ'' سے معنویت پیدا کرنے کی بات کہی ہے۔ اجمالاً اس طرح کی کیفیت بھی مصور سبزواری کی ذہنیت کے قریب ہی پہنچتی ہے بشر نواز نے رونق شہری کی شاعری کے تئیں فنکارانہ اظہار اور تجربے کو شعر میں ڈھالنے کے نمایاں رجحان کو اپنی پسند کے خانے میں رکھا ہے۔ شعریت کے حصول کیلئے سب سے پہلی شرط فنکارانہ اظہار ہی ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جس شاعر کے اندر مشاہدے کی آنکھ جتنی بصیرت افروز ہوگی وہ اتنی ہی گہرائی سے اپنے گردوپیش کے ماحولیات سے ہم آہنگ ہو کر شعر کو ارفع و اعلیٰ بنا سکتا ہے۔ رونق شہری نے ان شرائط کی تکمیل بڑی خوبی سے کی ہے۔ مظہر امام نے انتہائی خلوص سے رونق شہری کی شاعری پر مہر پسندیدگی ثبت کیا ہے۔ انھوں نے رونق شہری کو نئے طرزِ احساس کا شاعر قرار دیا ہے ساتھ ہی فیشن زدگی سے بھی محفوظ قرار دیا ہے۔ انھوں نے خصوصی طور پر ایک شعر درج کر کے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس زاویے سے شعر کہنا ہر کس و ناکس کی قسمت میں نہیں

ایسا کہاں ستارۂ قسمت کسی کا ہے
کم ہو غروب اور زیادہ طلوع ہو

عصری شعری منظر نامے میں انھوں نے رونق شہری کی آواز کو منفرد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی شاعری پر عمومیت کی مہر نہیں لگائی جاسکتی ہے۔

انور سدید پاکستان کے ایک سر کردہ ناقد ہیں انھوں نے رونق شہری کی چند غزلوں پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "ان کے جذبے اور اظہار میں مجھے تفاوت معلوم ہوتا ہے لیکن رونق شہری جہاں جہاں سنجیدہ ہوئے ہیں نئی امیجری سمیٹنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔محولہ سطور پر اگر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رونق شہری کی جو شعری پیکر تراشی ہے اس کا برملا اظہار جذبے اور انعکاس میں سد راہ ہیں میری دانست میں یہی رمزیت شعر کو بلند کرنے میں لاشعوری طور پر اہم رول ادا کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس کے بغیر امیجری سامنے آہی نہیں سکتی۔اس لئے انور سدید کی آدھی رائے سے کوئی واضح تصور سامنے نہیں آتا۔ظاہر ہے کہ باتیں سبز آتش کے فلیپ پر درج آراء کی روشنی میں آگئی ہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ شاعر کے وہ اشعار Quote کیئے جائیں جن میں عصری صداقت کا لہو روشن ہے اور شاعر کی ہنر مندی کا بیّن ثبوت ہیں۔

اُسی پہ کھلتے رہے ہیں ہمارے سب اسرار
ہم آسمان کی چادر سے سر چھپاتے ہیں
لیا تھا قرض کبھی جس سے اسکو واپس کر
زمیں کا بوجھ اٹھا آسمان پر رکھدے
کیا خبر تھی اک دن یہ سنگ میل بھی ہوگا
راستے سے پتھر ہم شوقیہ اٹھا لائے
جلتا ہے اک چراغ سا ہر وقت آنکھ میں
کس کو پتہ کہ دیر سے آتی ہے مری شام
وہی معصوم سی خواہش جسے گھر چھوڑ آیا تھا
بھرے بازار میں آکر مری انگلی پکڑتی ہے

لگا کر گھات بیٹھا ہے بدن کے ایک گوشے میں
لہو کی نہر کوئی مرے اندر کاٹ سکتا ہے
اپنے خوں کے رنگ سے دریافت ہونا تھا مجھے
کاٹ کر دستِ ہنر میں نے یہ فن زندہ کیا
مجھے سلیقے سے برباد کیوں نہیں کرتا
دعا محرکِ زیروزبر کو دیتا ہوں
وہ فطرت سبز سی قالین پانی میں بچھاتی ہے
سلامت جس نے پتھر کا پرندہ تک نہیں رکھا
مٹی بہروپ مناظر کے لئے ہے موزوں
مطمئن کیوں ہے مری خاک بدلنے والا

محولہ اشعار کی قرأت کرنے کے بعد قاری پُر لطف ذائقہ معنی سے قریب ہو جاتا ہے ان اشعار کی گونج اس لئے بھی باقی رہے گی کیونکہ شاعر خود حادثات و واقعات میں شریک ماجرا ہے۔ نئی غزل کے بنیاد گذار شاعر غلام مرتضیٰ راہی نے صحیح کہا ہے کہ "رونق شہری کا تجسس اور مضطرب ذہن موجودات پر اکتفا نہیں کرتا اور شاعری موجودات عالم پر قناعت کرنے کا نام ہے بھی نہیں۔ شاعری تو دراصل موجودات و مظاہر سے ان کیفیات کو اخذ کرنے کا نام ہے جو آسانی سے حروف و عبادت کی گرفت میں نہ آتی ہوں۔ رونق شہری کے شعری تجربے میں آنے والے مظاہر اور اشیاء مختلف معنوی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عام رویے اور نظریے سے انحراف ان کے تخلیقی ذہن کی معمولی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ تلاش و جستجو کے اپنے ذوق سے قاری کو بھی آشنا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خیال کی طرف اپروچ میں ایک ندرت اور کرافٹ کی ذہانت ہے جو قاری کو فوراً متوجہ کر لیتی ہے شاعری میں یہ خوبی مشق و مزاولت یا کسی اور شعوری کوشش سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تو گہرے مشاہدے اور کسب و کشش کی فطری صلاحیت کا کرشمہ ہوتی ہے۔ رونق شہری کی غزلوں میں انسانی سماجی اور سیاسی شعور بھی ہے اور جمالیاتی قدروں کی پاسداری بھی۔ انہوں نے روایت سے یکسر انحراف کرنے کے بجائے روایت کو داخلی شخصیت سے مربوط کر کے اسی کی نئی صورت گری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل نہ تو فیشن زدہ ہے نہ فارمولہ گزیدہ بلکہ انفرادی جذبے اور احساس کا بلیغ اظہار ہے"۔

محولہ سطور کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں کہ رونق شہری نئی غزل کے اہم دستخط ہیں۔

وھاب دانش

نام	:	عبدالوہاب (مرحوم)
قلمی نام	:	وہاب دانش
جائے ولادت	:	رانچی
تعلیم	:	ایم اے، ایل ایل بی
تصنیف	:	لبِ مماس (نظموں کا مجموعہ)
پتہ	:	کالی استھان روڈ، رانچی۔۱

وھاب دانش

رانچی کی تین بڑی ادبی شخصیتیں پرکاش فکری، صدیق مجیبی اور وہاب دانش مرحوم اپنی شعری تخلیقات کی ہمہ گیریت کی وجہ سے خاصے مشہور رہے ہیں ان میں وہاب دانش جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے۔ اپنے رفقائے خاص یعنی پرکاش فکری اور صدیق مجیبی سے اس معنی میں منفرد ہیں کہ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں انداز پیشکش کے اعتبار سے نئے جہانِ معنی کا پتہ دیتی ہیں۔ میرے سامنے شب خون کا شمارہ ۲۵۱ پیش نگاہ ہے اس میں ایک نظم شائع ہوئی تھی جسکا عنوان تھا کلام تقدس۔ چونکہ میرے مضمون کا محور وہاب دانش ہیں اس لئے ان کی غزلوں پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اس نظم کو پیش کرتا ہوں۔

میری نیک نظموں کو سینے سے لگا / چوم لے ہونٹ / آنکھوں کو رسم سچ سے پرُ نور کر / دیکھا! / وہ دشا / وہ نما.... / وہ نمائش / وہ منظر، نظارے جہاں / پرُ صفا پرُ لقا / پرُ عشار جسکی فجریں ہوں / سادہ صفت التجا / اے الہٰ! / میں کروں معنون / نام تیرے / وہ نظمیں / جو نثری ہوں / تیرے کلام تقدس کی طرح۔

وہابؔ دانش کی اس تخلیق کو میں خدا سے مکالمہ نہیں کہوں گا اس لئے کہ اس نظم کا لہجہ ملتجیانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ملتجی جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اس کے لہجے میں حد درجہ انکساری اور عاجزی ہوتی ہے۔ اس نظم کی فکری جہت وہابؔ دانش کی شاعری کی روشن سمت ہے انؔ کے غزلیہ اشعار میں بھی اللہ، خدا اور معبود جیسے مترادف الفاظ کثرت سے آئے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ وہاب دانش کا فکری شعور خدا سے ہمکلام ہوتے وقت کس قدر المناک ہوا ہے۔ وہاب دانش کی تخلیقات ان کے عہد کی دانشوری کا ایک باب ہے نثری نظموں کے سطور ہوں یا غزل کے پابند اشعار انھوں نے اپنے اندر کے وہاب دانش کو ذلیل ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ وہاب دانش نے خدا کے روبرعطا کی ہوئی زندگی کو جسطرح جھیلا وہ انھیں زندگی کا مجرم بنانے کے لئے کافی تھا لیکن کمال انانیت یہ ہے کہ سادہ لوحی کے ساتھ خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں کہا کہ جو بھی کہوں گا سچ کہوں گا۔ ظاہری بات ہے کہ شاعری کوئی حلفیہ بیان نہیں ہے کہ اس میں الزامات کی تردید جرح کی شکل میں پیش کی جائے۔ وہاب دانش کی

تخلیقات میں جو استعارے پیش کیئے جاتے رہے ہیں وہ عمومیت سے مبرّا ہے۔ وہاب دانش کی شاعری عوام کی نہیں خواص کی ہے۔ ان کے کلام کی جب ہم قرأت کرتے ہیں تو ذہن پر ایک مخصوص صوتی آہنگ کی فضا قائم ہو جاتی ہے جیسے سادہ صفت التجا، نظموں کو سینے سے لگانے کی استدعا یا پھر۔ مقفہ الفاظ کی تکرار جیسے پر صفا، پر لقا، پر عشا جیسی ترکیبیں وہاب دانش کی شاعری کی زنیت بنی ہیں۔ اس نظم کی مخصوص حوالے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ وہاب دانش کی غزلوں کا رنگ بھی انھیں اوصاف سے عبارت ہے۔ ایک غزل جو مشہور ادبی ماہنامہ ''الفاظ علی گڈھ'' میں شائع ہوئی تھی اس کا مطلع یوں ہے۔

سمت لاسمت خلا آنکھ اشارہ اللہ

ریت پر دوڑتے قدموں کا سہارا اللہ

واقعہ تو یہ بھی ہے کہ اس فقیرانہ صدا کے ساتھ پورے انڈو پاک میں وہاب دانش نے اس نوعیت کی پہلی غزل کہی تھی۔ شعر و ادب میں مکھی پر مکھی مارنے والوں کی کمی نہیں۔ اس غزل کی پیشکش کے بعد تو اسی بہانے بہتوں نے غزل میں اپنا مخاطبہ اللہ کے سپرد کیا ہے۔ لیکن ان کی آواز کوئی گونج پیدا نہ کر سکی۔ اس شعر میں وہاب دانش کی فکری سمت منور دکھائی دیتی ہے۔ شعر و ادب پر جب فیشن زدہ جدیدیت کا غلبہ تھا، مہمل گوئی، لایعنیت تخلیقات کے اندر سما گئی تھی۔ ایسے میں بہار اور جھارکھنڈ کے شعراء بھی گمرہی کے شکار ہو رہے تھے۔ وہاب دانش نے جدیدیت کی نہیں بلکہ صالح جدیدیت کی راہ پکڑی جس میں بکھرنے سمٹنے کا عمل تو ظاہر ہوتا تھا لیکن ناامیدی تکملیت کے جذبے کو معتوب نہیں کر سکی تھی۔ اس محولہ شعر میں سمت لاسمت کی ترکیب، خلا، آنکھ، اشارہ کا تشکیلی اظہار اور پھر اللہ سے مخاطبہ شعر کو دوسرے مصرعے کے نزول کے بعد طہارت کی منزل سے گذارتا ہے۔ اسی ردیف کے مقطع نے تو وہاب دانش کو بلندی کے مقام پر فائز کر دیا۔

سب سیاہی کے بنے شبد ہیں دانش کہ وہاب

کس سفیدی سے لکھوں نام تمھارا اللہ

اس شعر کو پڑھکر شہر عظیم آباد کے معروف شاعر ظہیر صدیقی کا یہ مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

میں اک ظہیر کتنے ظہیروں میں بٹ گیا

وہاب دانش کے مذکورہ شعر کو اسی شعری عمل کی دانشورانہ پیشکش کہا جا سکتا ہے۔ غور و فکر کا مقام ہے کہ وہاب دانش نے اپنے نام کے دو ٹکڑے کو بھی فنکارانہ ڈھنگ سے لخت لخت کر کے دکھا دیا ہے۔ شعر میں جو کلیدی نکتہ بیان کیا گیا ہے وہ سیاہی سے بنے شبد کی معذوری سے متعلق ہے۔ مناجات لکھنے کا یہ ڈھنگ وہاب دانش کو نہ صرف معاصرین میں ممتاز کرتا ہے بلکہ رب قدیر کے سامنے بھی سرفرازی کی منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔ سفیدی سے نام لکھنے اور سیاہی کے شبد کی کراہت کے بیچ جو کشمکش ہے وہ انتہائی عاجزی سے بیان کر گئے ہیں۔

اردو شعر و ادب میں خال خال ایسے شعراء ہیں جو مقدار و معیار دونوں پر ہی کھرے اترتے ہوں غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر نے بھی مقدار پر معیار کو قربان کرنا گوارا نہیں کیا۔ غالب جسطرح اپنی غزلوں کے انتخاب سے رسوا نہیں ہوئے اسی طرح معدودے چند اور بھی شعرا ہیں جنکے یہاں معیار کو مقدار پر اولیت دینے کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ مقدار کی محدودیت شعری سرمائے کی غربت کی ایک تصویر ضرور کہی جا سکتی ہے لیکن مجموعی طور پر ایسے کم ہی معاملے سامنے آئے ہیں۔ ہر چند کہ وہاب دانش کا شعری سرمایہ کم ہے لیکن ان کی کچھ غزلیں اہل رانچی ہی نہیں ملک کے متعدد جدید لہجے کے مستحکم شعراء پر آہنگ اور معنی آفرینی کے اعتبار سے بھاری پڑتی ہیں۔ جس زمانے میں جدید لہر بہہ رہی تھی اور حیرت و استعجاب کے نام پر غوغائیوں نے تہلکہ مچا رکھا تھا اس عہد میں بھی وہاب دانش کافی سلجھی ہوئی اور خوب سے خوب تر غزلیں کہہ رہے تھے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار کے تیور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آخر وہاب دانش جب وہ غزل میں بلندی طے کر رہے تھے اپنے سفر کو نامکمل چھوڑ کر کیوں نظموں کی طرف مراجعت کر گئے۔ غزلوں میں عصری حسیّت اور پھر دانش کا فنکارانہ شعور کچھ الگ ہی طرح کے پر لطف تناظر پیش کرتے ہیں۔

برجستہ ہو رہا ہے کھلے سر پہ کچھ نزول
سالم ہو دو گھڑی تو شکستہ بھی دیکھنا
جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہہ
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا
شام طرب ہے صبح تماشا بنی ہوئی
اس شہر نا سپاس کی محفل پہ آخ تھو

وہاب دانش نے محولہ اشعار میں شعر میں معنی کی عمارت سازی جس طرح کی ہے اس سے ذہن کے اس استعاراتی نظام کی طرف دھیان چلا جاتا ہے جہاں بانی، زیب غوری، شکیب جلالی، ساقی فاروقی افتخار عارف جیسے جلیل القدر شعراء کی شناخت اپنے لہجے کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ اردو غزل کا معاملہ ایسا ہے کہ درجنوں مجموعوں کا ڈھیر لگانے کے بعد بھی لہجے کی شناخت کا معاملہ جوں کا توں بنا رہتا ہے۔ نقش اوّل سے نقش ثانی کو بہتر بنانے کی شعوری کوشش میں یہ خیال ہی نہیں باقی رہتا کہ ہم جو اثاثہ اردو شعروادب کو سونپنے جارہے ہیں وہ نقش اوّل کے کلیدی رجحان سے کس حد تک ہم آہنگ ہے یا پھر اس میں سیرت آمیز تغیّر آیا ہے۔

محولہ پہلے شعر میں ''سر پہ کچھ نزول'' ہونے کا بھرم ہی کم حیرت ناک نہیں ہے کہ وہاب دانش کے اظہار بلیغ کی داد نہ دی جائے۔ جدید شاعری کی بنت ہی جزاور کل کی باہمی کشاکش پر قائم رہی ہے۔ شیئ کا سالم ہونا اور اس کے مکمل ہونے میں اجزاء کا انفرادی مطالعہ جدیدیت کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ وہاب دانش نے اس معاملے میں بے شک اپنی گہری بصیرت کا تعارف پیش کیا ہے دوسرا شعر تو دور جدیدیت میں بھی خاصا مشہور ہوگیا تھا اور آج کے عہد صارفیت میں بھی اسکی اہمیت مسلّم ہے۔ دنیا سے ایک سازش کے تحت چھینی جارہی معصومیت اور جنگل کی ہوا کے خلاف بڑھتی سازش گھٹن کے دباؤ کو بڑھاتی ہی جارہی ہے۔ ''شہر کے فقیہہ'' کا جنگلوں میں جا کر تفریحاً گھومنا اور پھر درختوں کے وجد کے عالم کے چھن جانے کا خوف ستانا اور پھر اسے شعری زبان عطا کرنا ہنرمندی کی روشن مثال ہے۔ اس شعر کی تہہ میں اترنے کی جرأت وہی حضرات کرسکتے ہیں جنکے یہاں نہ صرف عصری حسّیت کو سمجھنے کا سلیقہ ہو بلکہ تیزی سے متبدل ہوتے دنیا کے نباتاتی نظام کے مشینی تصرف کو ناجائز سمجھتے ہوئے سماجی مطالعے کی استطاعت موجود ہو۔ وہاب دانش کی ایک ایسی غزل بھی ہے جسکی ردیف ''آخ تھو'' ہے ''آخ تھو'' کی جب بھی بات آتی ہے تو ''غیاث احمد گدی'' کے افسانے آخ تھو'' کی طرف دھیان مرکوز ہو جاتا ہے۔ لفظی معنویت کے اعتبار سے نفرت کے اظہار کے لئے یہ صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ شعری ادب میں وہاب دانش واحد شاعر ہیں جنھوں نے اس دشوار ردیف کے ذریعہ نفرت کے علاوہ بھی اردو غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔

نئی غزل میں ''لاحاصلی'' ایک مشہور تخلیقی موضوع رہا ہے وہاب دانش نے اس کو برتنے میں خاصے محتاط واقع ہوئے ہیں۔

دن بھر کی دوڑ دھوپ کی حاصل پہ آخ تھو

قطرہ بنے عذاب تو ساحل پہ آخ تھو

اس شعر میں ''سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم'' جیسی کوئی عام بات نہیں بلکہ قطرہ کے حصول پر اکتفا کرنے کی گنجائش بھی جب موجود نہ ہو تو ایسے ساحل پہ آخ تھو کہنا کیا واقعی وہاب دانش کو زیب نہیں دیتا ہے؟ ان کے شعری ٹریٹمنٹ پر اثبات میں سر ہلانے کو جی چاہتا ہے۔ اہل رانچی نے وہاب دانش کے ساتھ جو سلوک ناروا کیا اس کا برملا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے۔

شام طرب ہے صبح تماشہ بنی ہوئی

اس شہر ناسپاس کی محفل پہ آخ تھو

عام طور پر جب شعراء شعر میں طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہیں اپنے حاصل شاعرانہ منصب سے کافی نیچے گر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی پہ کیچڑ اچھالنے سے پہلے ہاتھ کا گندہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن وہاب دانش کی طنزیہ کاٹ میں بھی محض آرائش لفظی نہیں ہے بلکہ معنوی شوکت محفوظ رہی ہے۔ وہاب کی شاعری میں پیکر تراشی کا جو انداز ہے وہ بہتوں سے اس معنیٰ میں الگ ہے کہ اس میں تخلیقی شان نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر اس ضمن میں ذیل کے اشعار پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

ہاتھوں سے گر نہیں تو نگاہوں سے دیجئے

اس صاحبِ نصاب بدن کا کوئی زکوٰۃ

گہرے نیلے پانیوں میں جانے کیا انجام ہو

سانس لے لیں اس جزیرے کی ہوا ہے آخری

ہوا کے چاروں طرف تھرتھراتی شئے کیا ہے

صدا شکستہ ہے تو پھر وفور لے کیا ہے

پردے کے روبرو پس پردہ بھی دیکھنا

اڑ جائے گا ہوا میں پرندہ بھی دیکھنا

اسلم بدر

نام	:	محمد اسلم
قلمی نام	:	اسلم بدر
والد کا نام	:	عبدالوحید (مرحوم)
تاریخ ولادت	:	۱۴؍مئی ۱۹۴۴ء
جائے ولادت	:	دربھنگہ
تعلیم	:	میکنیکل انجینئر
تصانیف	:	سفر اور سائے (شعری مجموعہ)
	:	کن فیکون۔ مثنوی
ملازمت	:	میکنیکل انجینئر (ٹاٹا اسٹیل)
سبکدوش	:	جون ۲۰۰۴ء
پتہ	:	روڈ نمبر ۱۸، جے۔ کے ایس کالونی، جواہر نگر، جمشید پور

اسلم بدرؔ

اسلم بدر شہر آہن جمشید پور کے ایک ایسے شاعر ہیں جنکی زندگی اور شاعری میں خوش تہذیبی کچھ اس ڈھنگ سے مخلوط ہوگئی ہے کہ غزل کا ہر شعر آئینہ بردار ہو کر شخصیت اور شعری قامت کو منعکس کرنے میں کامیاب ہے۔ یہ چھٹے دہے کے ان باشعور شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے انتہائی خاموشی سے جدیدیت کی لہر کو گذرنے دینے کے صبر آزما گھڑی کو بھی بے چین لمحوں کے ساتھ اپنے حافظے میں محفوظ و مامون رکھا اور دانشور کی طرح اپنے فکر وفن کا بھی جائزہ لیتے رہے۔ عام طور پر تخلیقی عمل سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ تخلیق کار کس حد تک شعر وادب کے مختلف میدانوں اور جہات میں سرگرم عمل اور اس کا ردعمل کیا ہے۔ مزید یہ کہ اپنی ایک مخصوص لابی بنانے میں کامیاب ہے کہ نہیں ۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اسلم بدر نے اپنی فقیرانہ روش کا ہی مظاہرہ کیا ہے۔ چھٹے دہے میں جہاں جدیدیت کی آواز گونج بن کر لوگوں کے دل و ذہن میں سما گئی تھی اور غزل میں ایک دلچسپ قسم کی Absurdity آ گئی تھی اس سے اسلم بدر آگاہ نہ ہوں ایسا بھی نہیں ہے۔ ابہام واہمال کی ایسی مکروہ فضا تیار کی گئی تھی کہ طنز ومزاح بن کر رہ گیا تھا اور خوش فکری فیشن زدگی کا شکار ہو کر مخصوص الفاظ کے دائرے میں سمٹ کر یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ عادل منصوری، ظفر اقبال، مظفر حنفی نے خصوصاً ایسا رنگ استہزائیہ اختیار کیا تھا کہ کئی دہے تک اردو غزل اپنے پھکڑ پن کی وجہ سے خاصی کمزور ہوتی چلی گئی۔ اسلم بدر نے اس عہد میں نیک کام یہ کیا کہ صالح ادبی نظریات کا حجم کر نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ غیر براہ راست طور پر اپنے ذہن فیشن زدہ رجحان سے علیحدہ رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ایک دور اندیش فنکار کی طرح معاملات زندگی اور ادبی روایت کے بیچ اس پُل کو پار کرنے میں کامیابی حاصل کی جہاں ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے'' کی مثال بہ خوبی دی جاسکتی ہے۔

غیر منقسم بہار ہی نہیں سارے ہندوستان میں جمشید پور کو ایک طرف جہاں ٹاٹا کی اسٹیل فیکٹری کی وجہ سے یادگار شہر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے وہیں انسانیت کی مرتی ہوئی چیخ کو دفنانے کے حوالے سے بھی جمشید پور حساس طبیعت کے ذہن میں شروع سے ہی موجود ہے۔ ادب میں فسادات کا موضوع بہت پرانا ہے لیکن اسے برتنے والے کم ہی ادیب سامنے آتے ہیں۔ غزلیہ

شاعری میں اسکی مثال روشن ہے۔اسلم بدر نے دراصل جمشید پور کے فساد کے المیے کوایک مستقل قدر کی حیثیت سے برتنے میں سب سے آگے اس لئے نہیں رہے کہ ان کے یہاں احساس کی سطح پر فسادات کا اظہار نوحہ گری کی شکل اختیار نہیں کرسکا ہے۔اسکی غالب وجہ یہ ہے کہ انھوں نے احتجاج کی لے میں شدّت کے ساتھ ساتھ فکروفن کا دامن بھی نہیں چھوڑا ہے۔

'سفراور سائے' اسلم بدر کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔'سفر اور سائے' اپنے آپ میں خود ایسا استعارہ ہے جہاں مسافر، راستہ اور منزل کی تثلیث قائم کرنا آسان ہو گیا تھا لیکن اسلم بدر نے 'سائے' کی موجودگی کا احساس کچھ ایسے ڈھنگ سے کرایا ہے جوان کے سفر کے ہمراہ بھی ہے اور محافظ کی شکل میں شب خون مارنے والا بھی ہے۔مجموعے کے نام سے کچھ لوگوں کو یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ اسلم بدر نے سفر اور سائے کا روایتی پس منظر ہی بیان کیا ہوگا جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔سفر اور سائے ان کی ایک مختصر سی نظم کا عنوان ہے۔سر پہ دھوپ کی چادر، تلووٴں میں پھپھولے، لبوں پہ پیاس، نگاہوں میں سراب کا موجزن ہونا، پیپل کے سائے کا گھنا نرم اور ٹھنڈا ہونا اور اخیر میں 'کھجور' کی بس دھوپ چھاوٴں کافی ہے اظہار کرنا اسلم بدر کے مخصوص ذہنی رویے کو واضح کرتا ہے۔پیپل ہندوستان کا ایک ایسا پیڑ ہے جسکی پاکیزگی اور حرمت ہندو مذہب میں بہت زیادہ ہے۔پیپل کاٹنا، ہتیا کرنے کے برابر ہے۔اسکی چھاوٴں بھی ہندو Myth میں روحانی لذّت کا اشاریہ ہے لیکن اسلم بدر کا سفر عرب کی ریگزار آبادیوں کی طرف ہے جہاں کھجور کی تمثیل دے کر انھوں نے اپنے گہرے تاریخی شعور کا پتہ دیا ہے اس کے باوجود 'سفر اور سائے' میں دوسرے معاملات انسان کی ازلی کمینگی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر۔

دشمنی دوستی کے باب میں ہے
وہ کتاب ان دنوں نصاب میں ہے
آگ سینے میں آنکھ میں آنسو
سیل آتش ہی سیل آب میں ہے
حادثوں کے در کھلتے بند ہوتے رہتے ہیں
ہم سکون سے کیسے گھر میں سوتے رہتے ہیں

زخم بن کے یوں رہئے قاتلوں کی بستی میں
سبز شاخ پر جیسے سبز طوطے رہتے ہیں
وار اپنے دشمن کا ہنس کے جھیلنے والے
ہنس کے بولنے والے دوستوں سے ڈرتے ہیں

اسلم بدرؔ کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر میں روز وشب کے ان عوامل کی کارفرمائی بہت کم ہے جس سے کوئی ذکی الحس فوری طور پر متاثر ہو کر تخلیق کرنے کا بہانہ تلاش کر لیتا ہے۔ جمشید پور اور ذکی انور دو ایسے محرکات ہیں جس کے زیر اثر وہاں کا ایک مخصوص ادبی حلقہ گاہ بہ گاہ خود کو پروجیکٹ کرتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں جوگا سنگھ انور کا نام نامی خصوصیت کا حامل ہے۔

آل انڈیا مشاعرے میں جوگا سنگھ انور کا کلام فرقہ وارانہ فسادات کا لرزہ خیز پس منظر پیش کرتا رہتا ہے حالانکہ اب جوگا سنگھ انور کا جادو ختم ہو چکا ہے۔ گجرات جیسے بڑے گدھ کے پروں میں چھوٹے شہر کے فرقہ وارانہ فسادات کے چوزے چھپ کر رہ گئے ہیں۔ بڑے فسادات کی ہولناکی بھی چھوٹے شہروں کے فسادات کا استحصال کرتے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ وقت کی چاک پر مٹی کی مخصوص شکل اختیار کرنے اور پھر اسے کوئی نام دینے کے لئے ہوڑ سی مچی ہوئی ہے۔ اسلم بدر نے بھی مکروہات زمانہ کو سمیٹا ہے لیکن مدھم مدھم خوش تہذیب سلیقے سے۔ مدھم مدھم میں نے اس لئے کہا ہے کہ ان کی تخلیقات میں فسادات کا موضوع Loud ہو کر سامنے نہیں آیا ہے۔ ایک باشعور فنکار کی طرح انہوں نے انسانیت کی لاش پر بیٹھے چیلوں اور گدھوں کی منظر کشی براہ راست نہ کر کے اسکی جگہ چشم تصوّر ٹانک دی ہے۔ مثال کے طور پر اسلم بدر کے درج ذیل اشعار اس قبیل کے ہیں کہ اس میں اہلِ جمشید پور کا دل تیزی سے دھڑکتا ہے۔

اس شہر ستمگار کی بربادی کے سائے
دیوار پہ کم ہیں پسِ دیوار بہت ہیں
صف بستہ منافق بھی مجاہد کی طرح ہیں
پہچانئے چلتی ہوئی تلوار کا لہجہ

اس شہر میں شب خون کے آثار بہت ہیں
ہم جاگ رہے ہیں تو گنہ گار بہت ہیں
ہم خاک وخوں میں ڈوب کے پڑھ بھی چکے نماز
واعظ غمِ اذان وضو لے کے آئے ہیں

اب اسلم بدرؔ کی شاعری کے اس مخصوص ذہنی رویے کی طرف آتا ہوں جہاں صدا کی موج نہیں ٹھہراؤ ہے اس ٹھہراؤ میں جواز پوشیدہ ہے۔ اسلم بدر اکثر مشاعروں میں اپنے اندازِ پیشکش سے خوش سلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر شعر کے مخاطبے میں کلیدی لفظ کی صوت اس طرح رکھتے ہیں کہ سامعین کی سماعت اس سے ہٹ نہیں پاتی۔ مثال کے طور پر موصوف کی دو ایک غزلیں ایسی ہیں جو اپنے معنوی تناظر، ردیف کی انفرادیت اور انداز پیشکش سے عوام وخواص کی پسندیدہ تخلیق بن گئی ہیں۔ اس کے چند اشعار درج کرنا چاہوں گا۔

کبھی شہر کوئی لٹا ہوا کبھی گاؤں کوئی جلا ہوا
مرے عہد کا یہی سانحہ مری شاعری کو عطا ہوا
ہے عجب سرور سا درد میں ہے عجب مٹھاس ساز ہر میں
مجھے ڈس رہا ہے کچھ اسطرح مری آستیں کا پلا ہوا

بحر سالم کی غزل کے چہار رکنی وزن 'متفاعلن' کے حُسنِ انتخاب نے اسلم بدرؔ کو مخصوص اپیل کرنے والا شاعر بنا دیا ہے۔ ایک دوسری غزل کے چند اشعار اس لئے درج کر رہا ہوں کہ یہ اشعار اسلم بدرؔ کے شعری مزاج سے بے حد مطابقت رکھتے ہیں۔

کہانی ایسی نہیں واقعہ ہی ایسا ہے
سنا ہی ایسا نہیں ہے ہوا ہی ایسا ہے
ہمیں ہی ڈھونڈے گا جب بھی لگے گی پیاس اسے
ہمارے خون کا کچھ ذائقہ ہی ایسا ہے
زمیں سے تابہ فلک روشنی کا زینہ سا
اٹھا ہوا کوئی دستِ دعا ہی ایسا ہے

اسی غزل کے ایک شعر

ندی بھی مانگتے مل جاتی، ہم نے مانگی پیاس

مزاج ہم کو خدا نے دیا ہی ایسا ہے

اسلم بدر کو اس منصب پر فائز کرتا ہے جہاں کربلا ایک مستقل استعارہ بن کر چمکتا ہے۔ نئی شاعری میں کرشن کمار طور کے بعد اسلم بدر کو میں کرب و بلا سے گذرنے والا تنہا شاعر مانتا ہوں جنکے یہاں فقر میں عجز دور تک جھلکتا ہے۔ محولہ شعر میں ندی، پیاس، مزاج اور خدا کے چہار لفظی تراکیب سے بامعنی معنوی حصار میں خود کو ہی لا کھڑا کیا ہے اور مخصوص طبیعت والوں کی ضیافت کا بھی سامان مہیا کر دیا ہے۔ اسلم بدر کا ایک اور شعر جسکی ردیف اسی کا تھا، ہے اس میں انہوں نے رنگ برنگ کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اسطرح کی تخلیقی ردیف میں اسلم بدر کو اپنی خلاقی کا نمونہ پیش کرنے کا خود بہ خود جواز فراہم ہو جاتا ہے الفاظ کی مشاطگی اور فکر کی سنجیدگی نے شعر کی عمارت کھڑی کرنے میں جو رول نبھایا ہے اہل فن اسے خوب سمجھتے ہیں۔ اس دشوار کن زمین میں ایسا مطلع کہنا اسلم بدر کے جگر کا ہی کام ہے۔

حیرت تو یہ نہیں ہے کہ خنجر اسی کا تھا

حیرت یہ ہے کہ تن سے جدا سر اسی کا تھا

گہرائی سے سوچتے رہنے کی جنھیں عادت ہو وہ سمجھتے ہونگے کہ اسلم بدر کی سوچ کا رینج کتنا لامحدود ہے کوئی شخص قاتل اور مقتول ایک ساتھ کیسے ہو سکتا ہے لیکن یہی حیرتنا کی اس شعر کی روح ہے۔ اس غزل کے دوسرے مختلف اشعار بھی اسی شان نزول کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن ان کی سمت الگ ہے۔ مثال کے طور پر

ہم کوہکن ہی رہ گئے شیریں اسے ملی

تدبیر ہم نے کی تھی مقدر اسی کا تھا

اسلم بدر کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ ہی اتنا بلند بانگ ہے کہ پہلے مصرعہ کی نزاکت معدوم

ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تدبیر بشری عمل ہے او مقدر پہلے سے تحریر شدہ عبارت ہے ان کے بیچ صبر و تشکر کی گنجائش نکالنا فقیر کی خواہش ہے۔ اسلم بدر نے یہاں بھی شعر کے ذریعہ خود کو محفوظ و مامون کرلیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلم بدر ایک ایسے باشعور شاعر ہیں جن کے حسن کلام پر کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔

اسلم بدر کی شاعری میں اسلامی تلمیحات کا خوش کن مظاہرہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے ان کے مخصوص Vision کا پتہ چلتا ہے عرب، صحرا، بلال، فاختائیں جیسے الفاظ متعدد بار استعمال ہوئے ہیں اس میں اپنی گمشدہ تہذیب کی بازیافت کی خو بھی ملتی ہے اور ان سے ذہنی میلان کا راستہ بھی ہموار ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر

سیاہ جسم پہ اجلی قبائیں کیسی تھیں
نظر نواز کسی کی ادائیں کیسی تھیں

عرب کے میر کے دل کو سکون تھا جس سے
ہمارے دیش کی ٹھنڈی ہوائیں کیسی تھیں

سجا کے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بچّوں کو
روانہ کرتی تھیں ان میں وہ مائیں کیسی تھیں

ہم رزم گاہ میں تھے اکیلے کھڑے ہوئے
سالار اس کے ساتھ تھا لشکر اسی کا تھا

ندی سے پیاس ملی ہے اسی گھرانے کو
کہ جس کے واسطے پانی چٹان سے نکلا

ابھی نہ مال غنیمت سمیٹیے کہ سوار
ہماری پشت کے ٹیلوں میں چھپ کے بیٹھے ہیں

لہو میں ڈوب گئی یک بیک فضا کیسے
افق پہ اڑتی ہوئی فاختائیں کیسی تھیں

میں چپ کے صحرا سے واپس ہوا تو یاد آیا
کنویں سے آتی ہوئی وہ صدائیں کیسی تھیں

شان بھارتی

نام	:	شمس الہدیٰ انصاری
قلمی نام	:	شان بھارتی
تاریخ ولادت	:	۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء
شغل	:	شاعری تنقید، صحافت، تبصرے
آغاز شاعری	:	۱۹۶۴ء
پیشہ	:	معمولی کاروبار
تصانیف	:	(۱) بیسویں صلیب (غزلوں نظموں کا مجموعہ) ۱۹۸۰ء
	:	(۲) آخری صلیب (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۹۰ء
	:	(۳) اوراق پریشاں (عابد عزیزی مرحوم کی غزلوں کا مجموعہ) کو مرتب کر کے شائع کیا۔
	:	(۴) ندی کا کنارا ڈوبتا ہے (شعری مجموعہ)۔ زیر ترتیب
	:	(۵) "نیم ملاقاتیں مشاہیر کے خطوط شان بھارتی کے نام" زیر طبع
ادارت	:	سہ ماہی 'رنگ' دھنباد
اعزازات	:	میرٹھ ایوارڈ، دارجلنگ کلا پریشد دارجلنگ، ادارہ اثبات ونفی کلکتہ کی جانب سے توصیفی سند، ادارہ، "اصنام" وشاکھا پٹنم کی جانب سے توصیفی سند
پتہ	:	ایڈیٹر سہ ماہی رنگ، بجوا، ضلع دھنباد (جھارکھنڈ)

شان بھارتی

کوئلے کی راجدھانی دھنباد محض بلیک ڈائمنڈ کے لئے ہی مشہور نہیں بلکہ چند ایسی شخصیات کی وجہ سے بھی مشہور و معروف ہے جنکی تخلیقات کی گونج ملک اور بیرون ملک میں یکساں طور پر سنی جاتی ہے میری مراد شان بھارتی سے ہے۔ جو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ جھارکھنڈ کی تشکیل سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی شان بھارتی اپنے شعری سفر میں مسلسل رواں دواں ہیں۔ ایسے تو شان بھارتی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں لیکن بحیثیت شاعران کا مقام بہت بلند ہے۔ مشترکہ شعری ''مجموعہ کالی دھرتی کی غزلیں'' جسے آمر صدیقی نے مرتب کیا تھا کی پذیرائی کے بعد ان کے دو شعری مجموعے ''بیسویں صلیب'' اور ''آخری صلیب'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ بیسویں صلیب ۱۹۸۰ میں شائع ہوا اور آخری صلیب ۱۹۹۰ میں۔ دس سال کے اس وقفے میں شان بھارتی نے نمایاں طور پر اپنے لہجے کی باز یافت میں کامیابی حاصل کی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دونوں مجموعے میں صلیب کا لاحقہ موجود ہے بیسویں صلیب، بیسویں صدی کا استعارہ ہے تو آخری صلیب، اکیسویں صدی کا نوحہ۔ قارئین کا ایک حلقہ غالباً یہ سوچنے پر حق بجانب ہوگا کہ شان بھارتی نے ان دو ناموں کے ذریعہ کسی صلیبی جنگ کا سیاسی نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود شان بھارتی نے جس پس منظر میں ان ناموں کو اپنی ذاتی پسندیدگی کی سند عطا کی ہے اس کے لیئے جا بجا پامال ہوتی خواہشوں کو صلیب پر ٹانگے جانے کا اشاریہ پیش کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر

چلو کہ مل گیا انعام حق پرستی کا
کہ انتظار میں ہم بھی کسی صلیب کے تھے
چہرے پہ خاک آنکھ میں موتی لبوں پہ آہ
اس قاعدے کا رخت سفر کس کے پاس ہے

درج بالا اشعار کی گہرائی میں اتر کر اگر ہم دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ شان بھارتی نے اپنی حق پرستی کا جواز بڑے سلیقے سے فراہم کیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں صلیب کے لیئے

منتظر رہنا شان بھارتی کی اس ذہنی کیفیت سے عبارت ہے جہاں ممکنہ واقعات وسانحات کا خیر مقدم کرنے کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے۔

شان بھارتی شہر سنگلاخ کے ان معتبر شعراء میں ایک ہیں جو گذشتہ چار دہائیوں سے اردو غزل میں اپنی موجودگی کا احساس کراتے رہے ہیں۔ شان بھارتی کو منتہی لہجے کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے یہاں جذبے اور احساس کے بیچ خط امتیاز آسانی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ شان بھارتی غزل میں خارجیت اور داخلیت دونوں ہی پس منظر کے اشعار پیش کرتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی شان یہ بھی ہے کہ اشارے، کنایے میں وہ باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جسکو تہہ داری کی صفت ڈھکتی ہے۔ شان بھارتی کی غزلوں کا لہجہ سادہ لیکن دوٹوک ہے۔ کالی دھرتی کی غزلیں جب شائع ہوئی تھیں تو اس کے کئی ایک اشعار ان کے خوش آئند مستقبل کی بشارت پیش کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر

مرے مذاق سفر کی ہے شان ہی کچھ اور
جو مجھ سے تیز چلے گا مری دعا لے گا

اسی قبیل کے متعدد اشعار ایسے ہیں جو شان بھارتی کی شعری طبیعت کا احاطہ کرتے ہیں۔ شاعر چونکہ معاشرے کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھتا ہے اس لیئے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی کبھی سوالیہ نشان بھی کھڑا کرتا ہے اس پس منظر میں شان بھارتی کا یہ شعر توجہ طلب ہے۔

نمو کا دخل تھا اس میں کہ خود نمائی کا
وہ مل کے خاک میں آخر گلاب کیسے ہوا

اس شعر کی قلب ماہیئت کا ڈانڈا غالب کے اس شعر سے جا ملتا ہے

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

شان بھارتی غالب پسندی کا شعری اعتراف باشعور قارئین سے زیادہ غالب کے ناقدین کے سامنے سلیقے سے کرتے نظر آتے ہیں۔ شان بھارتی کی مختلف غزلوں میں ان کا مخاطبہ حسن گویائی کو پیش کرتا

ہے۔شان بھارتی ہر حال میں مخاطب اور اپنے بیچ حد فاضل قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے مخاطبے میں طنز جب انانیت کا لباس پہن لیتا ہے تو لہجہ تلخ و ترش نہ ہو کر شائستہ بنا رہتا ہے۔شعر گوئی میں اس نوعیت کا انعکاس بمشکل ہوتا ہے۔معاملہ ایسا ہے کہ طنز میں جب شدّت پیدا ہوتی ہے تو خود طنّاز اپنے ہی پھینکے ہوئے پتھر سے گھائل ہو جاتا ہے لیکن شان بھارتی نے اس سفر کو بھی با آسانی طے کر لیا ہے مثال کے طور پر شان بھارتی کے یہ دو اشعار

بہت دشوار رستہ ہو گیا ہے
سفر اب جستہ جستہ ہو گیا ہے
انا جھکنے نہیں دیتی تھی جسکو
وہی اب دست بستہ ہو گیا ہے

لفظ شان تخلص بننے سے پہلے ہی اپنے اندر جامعیت رکھتا ہے۔لفظ شان اختیار کرنے کے بعد کئی معنوی جہتوں کا نشان بن گیا۔شان کے ساتھ لفظ شوکت کا استعمال جب تک نہیں کیا جائے اسکی پوری بلاغت ظاہر نہیں ہوتی۔حکمتِ شعر میں شوکتِ الفاظ اور شانِ مطالب کے بیچ حسین آمیزش پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے شان بھارتی شعر کاری میں اس رمز سے آگاہ و آشنا ہیں۔ شان بھارتی کے یہاں غزلوں میں عام لفظیات کا استعمال ہوتا ہے بھاری بھرکم فارسی اضافت سے شعوری طور پر پرہیز، زحاف اور تصرّفات کے کھیل سے بچتے رہنے کے شعری عمل میں کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر شعر کے مفہوم کا ابلاغ ہو جاتا ہے۔عام فہم الفاظ میں اپنے اپنے گرد و پیش کی صورت حال کو شعر میں ڈھالنا بہت بڑی فنکاری کہی جا سکتی ہے۔شان بھارتی اکثر و بیشتر عام لفظیات بڑے شعر کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے

کہاں لے آئی ہے بونوں کی صحبت
ہمارا قد بھی پستہ ہو گیا ہے
بلندیوں سے مسائل نظر نہیں آتے
میں اس زمین کو اب آسماں پہ رکھتا ہوں

زندگی ہو گئی گراں لیکن
کون اس بوجھ کو اتارے بھی

شانؔ بھارتی کے یہاں غزل کو سرمایہ دار بنانے کے لیئے ایک اور غالب رجحان دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہندی لفظیات کا برمحل اور چست استعمال کر کے غزل کے لوچ دار وجود کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل کا اپنا ایک مزاج، ایک تہذیب ہے۔ فراق گورکھپوری، کرشن موہن، جگر جالندھری، شیدا انبالوی نے اردو غزل میں ہندی کے نامانوس الفاظ کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے جس سے غزل مزید خوبصورت ہوگئی ہے۔ شان بھارتی کے یہاں بھی اسطرح کے فطری اظہارات لسانی ضرورت کے تحت پیش کیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار حوالے کے طور پر پیش کیئے جا سکتے ہیں۔

جیٹھ بھی ہم سفر تھا ساون کا
ہم نے دیکھے ہیں وہ نظارے بھی
جناب شان کا اب جھونپڑا بھی
شکستہ در شکستہ ہو گیا ہے

شانؔ بھارتی اپنی شاعری کے پس منظر میں غیر محسوساتی طور پر بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں جس سے ان کی خود احتسابی کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار اسکی واضح مثالیں ہیں۔

سیپیں ہیں سب کے پاس، گہر کس کے پاس ہے
جو میرے پاس ہے وہ ہنر کس کے پاس ہے
الفاظ پر نہ روحِ معانی پر حرف آئے
یہ اعتبار حرف دگر کس کے پاس ہے

درج شدہ اشعار میں شانؔ بھارتی کے یہاں یہ دعویٰ بے جا اس لیئے نہیں ہے کہ یہ بجا طور پر خود اعتمادی کے وصف کے مالک ہیں۔ غزل میں لفظ وصوت کا مطالعہ ایسا ہے کہ اچھے اچھے کاریگران غزل مناسب الفاظ کے استعمال کے محتاج بنے رہے ہیں۔ یہ ان کے ظرف پر منحصر کرتا ہے کہ اس خسارے

کا وہ برملا اظہار کریں۔ یا نہ کریں غزل کے مزاج داں جناب فضاؔ ابن فیضی نے ایک ملاقات میں رونق شہری سے کہا تھا غزل کی حرمت کے لیئے مناسب سے مناسب ترین موزوں الفاظ کی تلاش میں اگر کوئی شعر مہینوں تک مکمل نہیں ہوتا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آج کی اس بھاگ دوڑ والی زندگی میں کسے اتنی فرصت کہ حرمتِ الفاظ و معانی کے لیئے مہینوں مضطرب رہے۔ شان بھارتی کے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ الفاظ کے تصرفات میں محتاط واقع ہوئے ہیں۔ شوکت الفاظ کی نمائش نہیں بھی ہو تو سادگی کا ہنر کیا کم ہے جو معاصرین میں انھیں منفرد بناتا ہے۔

سفر کے ساتھ شعورِ سفر ضروری ہے
قدم قدم پہ نیا اک سراب نکلے گا
اگر تلاش کروگے زبان کا شاعر
تو شان بھارتی ہی انتخاب نکلے گا

شانؔ بھارتی کے یہاں یہ جرات ظریفانہ ہے کہ محاورات کو عام مفاہیم سے ہٹ کر بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' کے مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو ان اشعار کی قواعد کی رو سے تفہیم میں دشواری ہو سکتی ہے لیکن شان بھارتی نے ان کا برجستہ استعمال اس مخصوص کیفیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھنے کے بعد معنی الفاظ پر حاوی ہو گئے ہیں۔

ہم ایسے لوگ کہ بازار کو سمجھ نہ سکے
ضرر رساں تھا جو سودا خرید کرتے رہے
کسی پر حرف رکھنا ہو تو پہلے
کبھی خود اپنا بھی معیار پڑھنا

شان بھارتی اکثر غزلوں میں نزاکتِ ردیف کا سنجیدگی سے خیال کرتے ہوئے مخصوص شعری تمازت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ''بو لیئے'' ردیف اس نکتے کا مقتضی ہے کہ پوری غزل کا صوتی و معنوی موسم ایک خوش آہنگ لہجے سے قریب ہو۔ شان بھارتی نے یہاں اپنے کمال فن کا مظاہرہ اسطرح کیا ہے۔

غیر آستاں پہ یہ سر جھکا ہو تو بولیئے
سایہ اگر بدن سے جدا ہو تو بولیئے
ہر سمت بے کسوں کا لہو بہہ رہا ہے کیوں
اس شہر کا بھی کوئی خدا ہے تو بولیئے
جب لب کشا ہوئے تو زباں کاٹ دی گئی
چپ رہنے کی بھی کوئی سزا ہے تو بولیئے

تین مختلف غزلیں جسکی ردیف ہونا تھا ہوا۔ "ہونا تھا ہوئی" اور "ہونا تھا ہوئے" ہیں۔ اس کی پیشکش کی غرض وغایت میں شان بھارتی کی قادرالکلامی کا زیادہ دخل ہے۔ کسی الجھاؤ کے بغیر مضمون کو باندھنے میں کامیاب ہونا کافی نہیں لیکن متعلقہ ردیف کو مرکوز نظر رکھتے ہوئے صرف ونحو کے اعتبار سے اچھے اشعار نکال لینا کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر تینوں غزلوں کے دو دو اشعار نقل کرتا ہوں۔

اس کی محفل میں مرا تذکرہ ہونا تھا ہوا
آخرش رونما جو واقعہ ہونا تھا ہوا
اس تعلق سے کوئی کتنا کہاں تک سوچے
میرے دشمن کو اگر فائدہ ہونا تھا ہوا
دشمنی کے نام پر تو ہو چکا میدان صاف
دوستوں کے بیچ کی دیوار ہونا تھا ہوئے
یوں تو سب کو اعتماد اپنے پروں پر تھا مگر
جن پرندوں کو افق کے پار ہونا تھا ہوئے
اشک کی ایک بوند کو سیلاب ہونا تھا ہوئی
زندگی کو اس طرح غرقاب ہونا تھا ہوئی
ظلم کے لشکر کو ہونا تھا رواں ہوتا رہا
عدل کی تلوار کو بے آب ہونا تھا ہوئی

شانؔ بھارتی کی شاعری کی مختلف جہات کا مطالعہ ہمیں غور وفکر کی دعوت اس لیئے بھی دیتا ہے کہ ان کی شاعری کی جن کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ہٹ کر بھی اچھے اشعار وجود میں آئے ہیں۔ شان

بھارتی کا زندگی کے تئیں مخصوص رویہ تلخی کی صورت میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ جلتے مسائل کی آگ میں آج عوام کی کون کہے خواص تک جھلس رہے ہیں۔ ایسے میں شاعر تو خود ایک دلِ دردمند کا استعارہ ہوتا ہے۔ واقعات و سانحات کی لہریں انبساط و مسرت کو کب اپنا لقمہ بنا لیں گی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہی بے یقینی کبھی کبھی حقیقت بن کر جب سامنے آتی ہے تو شان بھارتی زیادہ مضطرب ہو جاتے ہیں ذیل کے اشعار میں اسی طرح کی پیچیدگیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ہواؤں سے اسے محفوظ رکھنا
کہ خاکستر میں چنگاری بہت ہے

چمکتی ہے جہاں تلوار ہر دم
وہاں جینے کی بیماری بہت ہے

اس بھروسے پہ نہ رہنا کہ ہے، رخ اور طرف
راستہ اپنا کبھی تیر بدل سکتا ہے

ہر شخص کی آنکھوں میں مسائل کے ہیں آنسو
ہونٹوں پہ ہنسی صرف دکھانے کے لیئے ہے

عجیب طور سے راس آیا عمر کا دریا
اسی سے پار لگے تھے اسی میں ڈوب گئے

اجالے سب کو راس آتے نہیں ہیں
بوقت صبح تارا ڈوبتا ہے

جب میری حفاظت کے یہ سامان نہیں تھے
تب اتنا مری جان کو خطرہ بھی نہیں تھا

ساتھ سورج کے ڈوب جاتا ہے
ہائے رے بے بسی نظارے کی

درج بالا اشعار میں اکثر و بیشتر موقعوں پر شان بھارتی نے اثبات و نفی کے بیچ اپنے مخصوص احتجاجی رویے کو فروغ دیا ہے جو نا مساعد حالات کی دین ہے۔ شان بھارتی نے سدا بہار قدروں کی نفی نہیں کی ہے لیکن ان کے اطلاق میں جو دشواریاں حائل ہیں یا پھر عوامی بے چینی کے سماجی زاویے سامنے آئے ہیں ان سے انھوں نے بھرپور استفادہ کر کے شعر کو ہمہ گیر بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

نجم عثمانی

نام	:	نجم الہدیٰ
قلمی نام	:	نجم عثمانی
والد	:	سید عبدالحلیم (مرحوم)
تاریخ پیدائش	:	۲۰ر ستمبر ۱۹۴۱ء
جائے پیدائش	:	پیر بیگھہ، گیا
تعلیم	:	انٹرمیڈیٹ (آئی۔ایس۔سی) پٹنہ یونیورسٹی
ملازمت	:	سی۔ایم۔پی۔ایف، آفس، دھنباد (ریٹائرڈ)
شعری مجموعہ	:	شمارِ نفس (شعری مجموعہ) ۱۹۸۴ء
		کالی دھرتی کی غزلیں (مشترکہ مجموعہ)
پتہ	:	آفیسر کالونی، واسعپور، دھنباد

نجم عثمانی

ساتویں دہے کے اوائل میں جن شعراء نے غزل کے قارئین کو متوجہ کیا تھا ان میں ایک نام نجم عثمانی کا بھی ہے۔ نجم عثمانی کی شاعرانہ شخصیت ان کی غزلوں کے آئینے میں صاف جھلکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدیدیت جب اپنی انتہا پر تھی تو ابہام اور اہمال نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اچھے اچھے شعراء فیشن زدگی کے دھارے میں بہتے دیکھے گئے۔ چونکانے کی شعوری کوشش، مروجہ الفاظ کا بلا جھجک استعمال، نامانوس تراکیب کو ٹانکنے کا چلن عام تھا لیکن اس عہد میں کچھ ایسے شعرا بھی تھے جو اپنے گہرے شعور و فکر اور ارضیت پسندی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ ان شعراء میں ایک نام نجم عثمانی کا بھی ہے۔ نجم عثمانی انسانی زندگی کے شکست و ریخت، زوال آمادگی، عدم تحفظ، فنائیت کو بھرپور تخلیقی توانائی کے ساتھ برتنے والے شعراء میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کتنا ہی وسیع المطالعہ کیوں نہ ہو جب تک اپنی ذات اور عرفانِ ذات کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے تب تک اس کی شاعری میں تہہ داری پیدا نہیں ہو سکتی۔ سماجی مطالعہ سے مراد ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس سے براہ راست یا غیر براہ راست طور پر تعلق ہوتا ہے۔ نجم عثمانی کے یہاں ذات و کائنات کا مطالعہ وسیع ہے۔ سماجی مطالعہ اور انسانی ہمدردی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ شاعر چونکہ معاشرے کا ذکی الحس ترجمان ہے اس لئے انسانی ہمدردی کا مادہ اس میں عام لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ سماجی مطالعہ کی بات آئی تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نجم عثمانی کی شاعری میں اخلاقی قدروں کا زوال، ٹوٹتی سرحدوں سے پیدا شدہ ہنگامہ خیزی اور فردیت کے تحفظ کا معدوم ہونا کچھ ایسے شعری مبادیات ہیں جو نجم عثمانی کی شاعری میں لاشعوری طور پر داخل ہو گئے ہیں۔ نجم عثمانی نے اپنے ذہن کے پردے پر ان واقعات و سانحات کے عکس کو بچا کر رکھا ہے جو مستقل طور پر ان سے رنجیدہ خاطر کرنے کا جواز ہیں۔ نجم عثمانی کی غزلوں میں صورت حال پر تبصرہ نہیں بلکہ مثبت و منفی اشاریہ ہیں۔ اس اشارے میں ان کی شعری حکمت عملی یہ ہے کہ نوحہ گری کی حد تک چلے آئے ہیں۔

نجم عثمانی کا پہلا شعری مجموعہ ''شمار نفس'' ۱۹۸۴ میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے اپنے نام کی بلاغت کے اعتبار سے نجم عثمانی نے لمحوں کا احتساب فکر اور فنی زاویے سے کیا ہے۔ یہاں شمار

نفس سے مراد سانس کی آمد و رفت سے ہے یہ سانس انسانی زندگی میں زندگی کی ضامن ہے۔ نجم عثمانی نے انسانی زندگی کو سانس گننے کا عمل قرار دیا ہے انسان کی عمر طبعی الگ چیز ہے اور لمحوں کا احتساب الگ شئے ہے اس نام سے نجم عثمانی نے پہلی بار اپنی فکری تعمق کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشہور ناقد عبدالمغنی نے نجم عثمانی کے اشعار میں عصری حسیت اور شعور ذات کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کی چستی اور عمدگی کا بھی ذکر کیا ہے عبدالمغنی نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ نجم عثمانی کے پاس کہنے کے لیئے کچھ اپنی باتیں ہیں جنھیں وہ دلچسپ اور پر اثر ڈھنگ سے کہہ سکتے ہیں۔ عبدالمغنی کے اس ریمارک سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعر تہی ذہن نہیں ہے۔ پاکستان کے مشہور دانش ور و ناقد محمود واجد نے نجم عثمانی کو مستقبل کی گمشدگی کا نوحہ گر کہا ہے۔ انھوں نے ان کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”نجم عثمانی نئی نسل کے ایک ابھرتے ہوئے غزل گو ہیں۔ نئی نسل میں رعایتاً نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ ابھرتے ہوئے ہونے کا محض گمان مجھے گذرا ہے۔ کم عمری کے کچے پکے جذبات کا شاعر کا کلام ایک مخصوص طبقے کو ایک طبعی مدت تک حظ پہنچا سکتا ہے اسے دم بخود یا حیرت زدہ نہیں کرتا جو کسی بھی معصوم شعری تخلیق یا تجربے کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں نجم عثمانی میں صلاحیت ہے کہ معصوم سی حیرت کے لمحے سے خود بھی دو چار ہوں اور قاری یا سامع کو بھی اس سے گزرنے کے مواقع فراہم کریں۔ محمود واجد نے نجم عثمانی کے متعلق درج بالا باتیں آج سے بیس پچیس سال پہلے کہی ہیں جبکہ اس بیچ نجم عثمانی کی شاعری میں بہت ساری تبدیلیاں آئی ہیں۔ نجم عثمانی کی فکری وفنی ترقی کا جائزہ لینے سے پہلے شمار نفس کے ان اشعار کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو ان کی مستقبل کی شاعری کا پیش خیمہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

ایک مرکز پر سمٹ کر رہ گئی ہے زندگی
جذب ہے دیوار ہی میں سایۂ دیوار اب

وجود اپنا گھروندا ریت کا ہے نجم عثمانی
بکھرنا ٹوٹنا ہر گام پر قسمت میں لکھا ہے

روٹھ جاتی ہے کیوں عروس سخن
جب بھی فکر معاش کرتا ہوں

پہلے خود اس نے کاٹ دیئے میرے دونوں ہاتھ
پھر طنزیہ وہ کہنے لگا بے ہنر مجھے
بھیڑ میں ہو گا گھٹن کا احساس
میرے کمرے کی ہوا لے جاؤ
لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں نجمؔ مری تلوار سے آج
اور مرا ہی کٹا ہوا سر ناچے میرے چاروں اور
درخت پر سانپ چڑھ گئے ہیں
ہیں شاخ پر بے خبر پرندے
مجھکو تری تلاش ہے کب سے یزید وقت
آب حیات تیرے ہی خنجر میں قید ہے
تمام رات میں اب چونک اٹھتا ہوں
بلائیں چیختی رہتی ہیں میرے گھر کے قریب
میں ایک قطرہ ہوں بچھڑا ہوا سمندر سے
نہ جانے کب سے سمندر مری تلاش میں ہے
سب ڈوبنے لگے تو ابھر نا پڑا مجھے
ہر لمحہ بحر غم سے گز رنا پڑا مجھے

شمار نفس کی اشاعت کو دو دہے سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس طویل مدت میں نجم عثمانی نے فکر وفنی میدان میں زبردست جست لگائی ہے شعر و ادب میں بدلتی ہوئی صورت حال کے لئے جولوازات جوابدہ ہیں وہ زمان و مکان کے بیچ فاصلے کا بڑھنا ہے۔ بین الاقوامی طور پر آج ہم آفاقیت پسند ہو چکے ہیں آج کا انسان عہد صارفیت میں جی رہا ہے کمپیوٹر کے عہد میں جینے والے انسان کا مقدر بھی مشینوں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ جز اور کل میں کشمکش کم اور قربت زیادہ ہے ہماری ریزہ ریزہ خواہشوں کو سمیٹنے والا کوئی دوسرا فرد نہیں بلکہ اپنی تمام ٹریجڈی کے لئے آج کا انسان خود ذمہ دار ہے ایسے میں دیکھنا یہ ہوگا کہ نجم عثمانی جیسا شاعر کس طرح سوچتا ہے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ نجم عثمانی کا سماجی مطالعہ

درون شعر اور باہر بھی جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر

نجم ہر شعر ہے آئینۂ احوالِ ستم
یہ غزل ہے کہ کسی عہد کا نوحہ کوئی

نجم عثمانی نے اس شعر میں آئینہ احوالِ ستم کی ترکیب میں بڑی کاریگری دکھائی ہے۔ کاریگری اس معنی میں کہ پہلے مصرع میں آئینے کے ساتھ احوال ستم کی اضافت سے معنی کا نیا جہان خلق ہوا ہے۔ لفظ ستم کوئی روایتی پس منظر کا لفظ نہیں رہا۔ یہ بالغ نظر شاعری کی قدرت کمال پر منحصر ہے کہ کس طرح اس کا مصرف لیتا ہے۔ کسی عہد کا نوحہ بیان کرنا کمال کی چیز نہیں کیونکہ تیسرے درجے کا شاعر بھی زمانے کے نشیب وفراز پر اپنا زاویۂ نظر رکھتا ہے زاویہ نظر کی بات آئی تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حسب حالات وہ اپنے عہد پر طنز کا پتھر پھینکتا رہتا ہے لیکن اگر شاعر اپنی تخلیق یعنی غزل کو ہی اگر کسی عہد کا نوحہ قرار دے تو اس کے کہنے میں کچھ رمزیت ضرور ہے۔ نجم نے اپنی نئی پیش رفت کا اس معنی میں مناسب احتساب کیا ہے کہ واقعات وسانحات ان کی غزل کی واردات کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ بیس پچیس سال قبل نجم کی شاعری میں جدّت محسوس کی گئی تھی جسے ان کے کئی معاصرین نے بھی اپنایا تھا۔ جدیدیت کے اس دور میں ایک لمبی فہرست ایسے شعرا کی تھی جنکے یہاں نہ صرف لہجے میں یکسانیت تھی بلکہ پھوہڑ پن میں بھی برابر کا ریکارڈ توڑنے کی دھن تھی۔ یہ سارا ہنگامہ فیشن زدگی کی دین تھا۔ نجم عثمانی شروع سے ہی بھیڑ چال کے مخالف رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

با آسانی کسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے اک پل میں
ہر اک رشتے کا چہرہ بھی بدل جاتا ہے اک پل میں
دل سے چہرے کو جدا رکھنا بھی فنکاری ہوئی
آپ کو اے نجم صاحب یہ ہنر آیا کہاں

محولہ اشعار میں نجم عثمانی نے اپنی ذات شریف کو بھی ہدف بنایا ہے۔ یہ ہدف بننا بھی کسی صلہ رحمی کے نتیجے میں نہیں آسان ہوا ہے بلکہ حق کی جستجو کے لیئے دشوار گذار راستے پر چلنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نجم کے یہاں سیاسی بصیرت بھی ہے۔ مثال کے طور پر

وہ رتھ پر بیٹھ کر نفرت کا کارو بار کرتا ہے

کوئی بھی سانس لیتا شہر جل جاتا ہے اک پل میں

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات صرف دو قوموں کے بیچ تصادم کا نام نہیں رہ گیا بلکہ اس کے کئی چہرے بہروپ مناظر کی چھاؤں میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ غزل کے لئے کچھ ایسے موضوعات آج بھی شجر ممنوعہ کی طرح ہیں اس میں سیاست اور جنس کو شعری پیکر عطا کرنا خاصہ دشوار کام ہے۔ نجم عثمانی سیاسی بصیرت کے معاملے میں اپنے اہل نظر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مثال کے طور پر

تاریخ یہ کہتی ہے کہ اس درجہ لہو رنگ

تصویر تری خطۂ گجرات نہیں ہے

نجم عثمانی نے اس شعر میں خطہ گجرات دکھا کر سارے ہندوستان کی لہولہان صورت حال پر زبردست طنز کیا ہے ظاہر ہے کہ جس خطے سے امن کا پیغامبر ساری دنیا کو عدم تشدد کا درس دے کر خود تشدد کا شکار ہو گیا وہی مخصوص خطہ آج بدترین قسم کے فسادات کا استعارہ بن گیا ہے۔ نجم عثمانی کی نوحہ گری اپنی ذات سے شروع ہو کر گجرات پر ختم نہیں ہوتی بلکہ عراق کے کوچۂ کربلا تک جاتی ہے۔ مثال کے طور پر

کب تلک خوں میں نہائیں گے فلسطین و عراق

نصرت حق دشمن باطل نہ جانے ہے کہاں

نئی غزل میں بے رشتگی، بے تعلّقی، بے مرّوتی جیسے موضوعات کو بہت کم جدید شعراء نے کامیابی سے برتا ہے۔ اکثر و بیشتر نے ایک طرف معاملۂ واردات کو قلب شعر میں ڈھالا ہے جس سے دوسرے فریق یا پھر مخاطب کی صدائے دل کم ہی سننے کو ملتی ہے۔ اس معاملے میں سلطان اختر واحد شاعر ہیں جنھوں نے پر جواز اور بلند بانگ ہو کر جس طرح کہا ہے

اندنوں تم سے نہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں

اسی پس منظر میں نجم عثمانی نے بھی اپنے محسوسات میں ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کی نوحہ گری اپنے مخصوص

انداز میں پیش کی ہے۔

با آسانی کسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے اک پل میں
ہر اک رشتے کا ہی چہرہ بدل جاتا ہے اک پل میں
اس شہر تکلف میں ملا کون کسی سے
تقریب کوئی بہر ملاقات نہیں تھی

رشتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ آج کے مادیت پسند عہد میں کوئی چہرہ مکمل طور پر سلامت نہیں ہے اس کا برملا اظہار نجم عثمانی نے اپنے مخصوص اسلوب میں کیا ہے۔

خوشبوئے خاک تعلق کوئے دل تک لے گئی
مجھ سے ملنے کیلئے سپنوں کا گھر آیا کیوں

نجم عثمانی کے متعدد اشعار اس نوعیت کے ہیں کہ جدید شعری منظرنامے کے کینوس پر آسانی سے ٹانکے جائیں۔ گزشتہ ایک دہے میں ان کے یہاں نظموں اور دوہوں کے وسیلے سے بھی تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ہے جسکا عنوان ''سبھی منتظر ہیں''، نظم کا عنوان ہی اس تجسس کے در کو وا کرتا ہے جہاں دستک سننے کے لیئے کوئی منتظر ہے۔ نظم مختصر ہے لیکن اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔

ہوا گرم ہے
زمیں جل رہی ہے
آسمان سے برستا ہے خوں
ہر طرف شور ہے
'الاماں، الاماں'
جسم میں ایک قطرہ لہو بھی نہیں
سانس لینا بھی دشوار ہے
ہاتھ اٹھتے نہیں ہیں دعا کے لیئے

ہاتھ مفلوج ہیں
کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہے اب
سبھی منتظر ہیں''۔

حالیہ برسوں انھوں نے کچھ دوہے کہے ہیں جس میں غزلوں کی طرح عصری حسیت موجود ہے۔ غزل کی تنگ دامانی کا اگر رونا نہیں بھی رویا جائے تو کامیاب دوہا نگاری کے لئے کوئی بندھا ٹکا موضوع صحیح نہیں ہے اس لیئے نجم عثمانی نے متروک خیال کی وضاحت کا بہانہ بنا کر اچھے دوہے نہیں کہے ہیں بلکہ موضوع پر احساس کا دباؤ ہی کچھ اس قدر زیادہ ہے کہ دوہے کی تمام شرطیں پوری ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر

بہن بھائی کے رشتے میں آیا فرق عجیب
کس سے پوچھیں کیا ہوئی راکھی کی تہذیب
درخت سب کٹتے گئے گاؤں ہوا ویران
بیماری اور بھوک سے کیسے لڑے انسان
چلے نہیں تنخواہ سے گھر کا کارو بار
رشوت تیرا نام ہے جیون کا معیار

نجم عثمانی کے تعلق سے تحریر کی گئی تمام باتیں چونکہ ان کے شعری ہنرمندی سے منسلک ہیں اس لیئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ نجم ایک خوش وضع لہجے کے حامل جدید شاعر ہیں۔

ہمیشہ نثری نظم متنازع فیہ رہی ہے۔ شعروادب میں ایک حلقہ اس کا سخت مخالف ہے تو دوسرا اس کی موافقت میں دلیلیں پیش کرتا ہے۔ نجم عثمانی موخر الذکر حلقے کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ نظموں کے سنجیدہ قارئین اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ نثری نظموں کے بھی محدود شعرا ہیں جنکے یہاں بھرپور تخلیقی توانائی ہے۔ اسی قبیل کے شعراء میں نجم عثمانی بھی ہیں جنکے یہاں نظموں میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے جو قارئین کو پڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ سیاسی بصیرت کی بات ہو یا تلمیحات کے سہارے سانسوں کے گننے کا عمل نجم عثمانی اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ ذیل کی نظمیں حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک نظم جس کا عنوان 'المیہ' ہے اس میں آزادی کی حصولیابی کے بعد چکنا چور ہوتے خواب پر

گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔اس طویل نظم کا کلائمکس یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

اس سے بہتر تھا کہ میں
ان فرنگی حاکموں کے شانہ بشانہ
جنگ آزادی کے دیوانوں سے
نبرد آزما ہوتا
لوگ آزادی کے دلکش اور سہانے
سپنے دیکھتے رہتے
ایسا بد کردار
پیدا حکمراں طبقہ نہ ہوتا
دیش بے چہرہ نہ ہوتا

ایک دوسری نظم یوں ہے

سخت طوفان اور سیلاب
کے حصار میں قید
اپنی سانسوں کو گنتے
لوگوں کے واسطے
اگر چہ تم
کشتی نوح نہ بن پائے
بلند و بالا درخت بن کر
فضا میں پھیلائے بازؤں کو
بتاؤ کب تک رہو گے قائم
جب آئے گی کوئی بلا خیز تیز آندھی
تو کیا تمھیں معاف کر ہی دے گی۔

محولہ نظموں کے موضوعات اور نجم کا زاویہ نظر کسی طرح ایکدوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ان نظموں میں نجم عثمانی نے سوالیہ نشانات قائم کئے ہیں۔

نجم کی غزلوں میں جدید حسیّت کی موجودگی کا اعتراف بہتوں نے کیا ہے شاہد حکیم مرحوم کی مرتبہ ''بہار کے جدید غزل گو'' میں نجم عثمانی کا کلام شامل ہے۔ پنجابی زبان کا ماہنامہ 'لو' (लौ) جس نے ۱۹۸۷ میں اردو غزل نمبر شائع کیا تھا۔ ۳۸ / جدید شعرا کی فہرست میں ایک نام نجم عثمانی کا بھی تھا۔ علاوہ ازیں ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے نمائندہ ادبی رسالوں میں نجم عثمانی تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان دنوں پاکستان سے شائع ہونے والا موقر جریدہ 'آئندہ' کے مقامی نمائندے کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس رسالے کے تقریباً ہر شمارے میں نجم عثمانی کا کلام شامل اشاعت ہوتا ہے تمام کوائف پر نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ نجم عثمانی جھارکھنڈ کے اہم جدید غزل گو ہیں۔

آمر صدیقی

نام	:	محمد اشرف الحق
قلمی نام	:	آمر صدیقی
تاریخ پیدائش	:	۲؍ستمبر ۱۹۵۰ء
جائے پیدائش	:	جھریا، ضلع، دھنباد
تعلیم	:	بی، ایس، سی، ادیب (علیگڑھ)
والد	:	شاد محمد صدیقی
آغاز شاعری	:	۱۹۶۳ء
پہلی غزل کی اشاعت	:	ماہنامہ سہیل گیا۔ ۱۹۶۳ میں
دیگر اصناف	:	ادبی مضامین، تبصرے، چند افسانے
تلمذ	:	علامہ ابر احسنی گنوری
ملازمت	:	محکمۂ فروغ انسانی وسائل (کٹیہار)
تصنیفات	:	مرتب: ''شعلۂ حرف'' (مختلف شعراء کا مجموعہ کلام)
		چراغ بولتے ہیں۔ (شعری مجموعہ) ۲۰۰۴ء
		کالی دھرتی کی غزلیں'' (کول فیلڈ کے نمائندہ شعراء کی غزلیات کا مشترکہ مجموعہ)

آمر صدیقی

اردو کی روایتی غزل گل وبلبل، لب ورخسار اور ظاہری آرائش کے تذکرے سے بھری پڑی تھی۔اس پر لکھنو، دہلی جیسے ادبی اسکولوں کی گہری چھاپ موجود تھی۔عشق حقیقی کا اظہار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ غزل کے مضمون میں ابتذال کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔غزل کے قارئین اسطرح کی یکسانیت سے اوب گئے تھے پھر اس کے بعد ترقی پسندی کا دور آیا۔یہاں بھی مخصوص الفاظ کے ذریعہ نعرہ بازی سے انقلاب زندہ باد کی گونج سنائی دینے لگی۔ترقی پسندوں نے غزل کو سیاست زدہ کر کے رکھ دیا تھا وہاں بھی غزل پامال ہوتی رہی اور جب جدیدیت کی لہر نے دستک دی تو غزل نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔اب آنکھیں زندگی کو جس روپ میں دیکھ رہی تھیں ذہن ودل پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ایسا محسوس ہوا جیسے غزل نے فطری طور جدیدیت کے فکری نظام کو اوڑھ لینے میں عافیت محسوس کی ہو۔ظاہر ہے کہ یہ اس کی بقا کا سوال تھا۔اسی دور میں آمر صدیقی نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ عہد کشمکش کا دور تھا۔آمر صدیقی نے اپنے نپے تلے شعری برتاؤ سے غزل کے مثبت رویوں کی طرف پیش قدمی کی جہاں انھیں خاطر خواہ کامیابی ملی۔انہوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا اور جھیلا ہے۔آمر صدیقی نے سن بلوغ سے زندگی کے آخری ایام تک انا کی جنگ لڑی ہے انھوں نے اپنی محنت شاقہ کی بدولت ایڈلٹ ایجوکیشن میں ملازمت حاصل کی۔ابھی ملازمت کے حصول کی خوشی سے محظوظ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس پوری اسکیم کو ہی منسوخ کر دیا گیا۔تمام ملازمین کے خوابوں کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔انھیں محکمہ فروغ انسانی وسائل میں بحثیت کلرک ازسر نو بحال کر لیا گیا اور ان کی پوسٹنگ کٹیہار کر دی گئی۔پوری فیملی جھریا میں مقیم رہی اور وہ کٹیہار میں ڈیوٹی پر ایماندار پولس کی طرح تعینات رہے۔چھٹیوں میں گھر آتے۔اس طرح کی بے ہنگم زندگی نے اُن کی صحت کو کافی متاثر کیا اور وہ ٹوٹ سے گئے۔صحت دب بدن رو بہ زوال ہوتی رہی۔زندگی نے وفا نہ کی اور وہ حبس زدہ دنیا کو خیر آباد کہہ گئے ان کے بیشتر اشعار زندگی کے تلخ تجربات کے آئینہ دار ہیں۔

اسی مقام پہ لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا
خود اپنا حال جہاں گفتگو میں شامل تھا

لہراتی ہے آنکھوں میں عجب قوس قزح سی
اترا ہے کلیجے میں کوئی تیر سر شام
ناکام حاسدوں نے تہی دست کر دیا
لوٹی ہوئی پتنگ تھی کچھ دیر کے لیئے
نظر نہ آئے وہ منظر پکارتا ہے مجھے
سفر میں ہوں تو مرا گھر پکارتا ہے مجھے
ہوا کے دوش پریوں تتلیوں کے پر چمکتے ہیں
ہم آنکھیں بند بھی کرلیں تو چنگاری نکلتی ہے
ہم نے تو سنگھرش کیا ہے تب ٹوٹے
کتنے تھے جو خوف کے مارے ٹوٹ گیئے
اس خرابے میں کوئی رت ہو جناب آمرؔ
میری قسمت میں ہے دن رات سلگتے رہنا

زندگی کے زبردست مشاہدے نے آمر صدیقی کی شاعری کے لیئے زمین تیار کی اور شاعری کے افق پر ادب کاہ روشن ستارہ بنادیا جسکی تابنا کی سے اردو تا حیات جگمگاتی رہے گی۔ دھنباد جیسی سنگلاخ زمین پر اردو ادب کے کئی تناور شجر وجود میں آئے۔ غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی نے دھنباد کو ادبی دنیا میں روشناس کرایا۔ اس کے بعد دور دور تک نثر کے میدان میں کوئی بڑی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جو ادب کا علم بلند کر سکے۔ اس کے باوجود یہاں کے چند اہم شعراء جو غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی کی حیات میں ہی شعر و ادب کے در پر دستک دے چکے تھے ان میں آمر صدیقی۔ رونق شہری، شان بھارتی نجم عثمانی کے اسمائے گرامی احترام سے لیئے جاتے ہیں۔ آمر صدیقی ایک اہم غزل گو تھے ۔انہوں نے جو کچھ لکھا عمیق مشاہدے کی روشنی میں لکھا۔ ان کی غزلوں میں جدت طرازی کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں شعری فکر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بیشتر شعروں میں عصر حسیّت کی جھلک ملتی ہے۔

بارودی ماحول میں اک چنگاری سے بھی
اک لمحہ صدیوں کا نوحہ بن جاتا ہے
تیز آندھی میں کوئی پیڑ سلامت ہی نہیں
کون ایسے میں کہے چھاؤں گھنی میری ہے
اب لہو کی وضاحتوں کے لئے
رنگ پانی میں، بو ہوا میں ہے
کیا خبر تھی آتے جاتے موسموں کے درمیاں
چھوڑ جائے گی درختوں پر نشاں لا منظری
سر ہی نہیں تو فکر عبث ہے کلاہ کی
اونچا ہے کتنا خوف کا مینار دیکھ لو

آمر صدیقی کے تعلق سے حق تو یہ ہے کہ یہ نہ صرف فن آگاہ شاعر تھے بلکہ جدید غزل گو کی حیثیت سے بھی مشہور و معروف تھے۔ کہتے ہیں کہ نام کا اثر عمل پر بھی پڑتا ہے۔ آمر صدیقی کا اصل نام محمد اشرف الحق تھا۔ آمر صدیقی ایک ایسے شاعر تھے جنکے یہاں خودداری، انانیت اور تشکر ان تینوں لوازمات نے مل کر ایک ایسے وجود کی تخلیق کی تھی جو اپنی ذات سے کم اور اشعار سے زیادہ مترشح تھا آمر صدیقی نے روایت، ترقی پسندی اور پھر جدیدیت تینوں عہد کی شان وشوکت کو نہ دیکھا ہے بلکہ اپنی تخلیقات سے ظاہر بھی کیا ہے۔ آمر صدیقی کے شعری مجموعے، چراغ بولتے ہیں، نے بھرپور عصری حسّیت کی شاعری کو پیش کیا ہے۔ یوں تو آمر صدیقی نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں لیکن ان کا اصلی جوہر غزلوں میں کھلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید غزل خارجیت اور داخلیت کی کشمکش میں گرفتار رہی ہے۔ آمر صدیقی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے یہاں جدید شعری منظر نامے میں جتنے رنگ دکھائی دیتے ہیں وہ ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اوزان و بحور پر عبور رکھنے والے فنی محاسن اور معائب کے بیچ خط امتیاز کھینچنے والے آمر صدیقی اپنی غزلوں میں عصر حسّیت برتنے میں کافی محتاط رہے ہیں۔ نئی زمین نئی ردیف کا شعوری انتخاب حدید غزل گویوں کی بھیڑ میں انھیں منفرد بناتا ہے۔ آمر صدیقی کے ساتھ معاملہ ایسا ہے کہ انھیں قاعدے سے کوئی ایسا ناقد میسّر نہ ہو سکا جو ان کی شعری جمالیات اور زندگی کے

تئیں ان کے حسن سلوک کو پروجیکٹ کرتا۔ مشہور جدید شاعر پرکاش فکری نے آمر صدیقی کے لفظی اور شعری آہنگ کے متعلق بجا طور پر صحیح کہا ہے کہ ''جہاں تک لفظی اور صوتی آہنگ کا سوال ہے تو آمر کی غزلوں میں اُن عناصر کی کارفرمائی ہے جنھیں ہم زمینی اور معاشرتی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں الفاظ کی خارجی اور داخلی معنویت میں ایسا کوئی بعد نظر نہیں آتا طبعاً بھی وہ تصنع اور تضاد سے پاک ہیں لہٰذا وہ شاعری میں بھی اسی طرز کے حامی ہیں۔ ان کے یہاں شاید ہی کوئی ایسا شعر ہے جسکی روح الفاظ کے بوجھ تلے دبی ہوئی محسوس ہو۔ اور شاید اسی لئے ان کی شعری سرشت اپنی آواز کی شناخت دوسروں تک پہنچانے میں پر پیچ راستوں کے محتاج نہیں۔''

محولہ سطور نقل کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ لفظی اور صوتی آہنگ کے حوالے سے آمر صدیقی غزلوں میں کس طرح سے آواز کی خوش لذّتی یا پھر خوش قرأت ہونے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں ذیل کے اشعار مطالعہ کے لیئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نشاط رنگ دعاؤں میں گھولنے والا
کوئی تو ہے مرے لفظوں کو تولنے والا

پڑھ رہی ہے کھلی کتابوں کو
تہ بہ تہ جستجو ہواؤں میں ہے

اسی مقام پر لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا
خود اپنا حال جہاں گفتگو میں شامل تھا

اسے پڑھو تو نگاہوں کو بے وضو نہ رکھو
کتاب عہد کا ہے اقتباس سناٹا

صدا کنویں سے جو آتی تھی تھم گئی تو لگا
یہیں کہیں تھا مرے آس پاس سناٹا

روشنی سے کوئی لفظ عاری نہیں
کس اندھیرے کا ہے مرثیہ آسماں

آمر صدیقی نے ٹوٹتی ہوئی قدروں میں معنویت تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جو شاعری کو دوام

بخشتی ہے۔

پکارتا رہا میدان نینوا پھر بھی
نہ آسکا کوئی کوفی نفاق سے باہر

آمر صدیقی کے بہت سے اشعار ان کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں حالات کے پیش نظر ان کا جسم ٹوٹتا رہا لیکن مزاج میں وہ تونگری کارفرما تھی کہ انھوں نے بڑے بڑوں کے حضور کبھی گھٹنے نہیں ٹیکا۔ یہی انداز ان کے شعری حسن کو دو بالا کر رہا ہے۔

بلند تر سہی بامِ عروجِ عصر رواں
تو کیا یہ مان لیا جائے کچھ نہیں ہے فلک
میں چاہتا ہوں رات کا سورج کہوں اسے
لیکن سوال یہ ہے کہ بولے کوئی چراغ
سبھوں نے دیکھا اسے اپنی عینکوں سے مگر
سوال یہ ہے کوئی اس کے پاس تو جائے
تاریکی کا لشکر لے کر نکلے ہو
نیزے پر رکھ لو میرا سر روشن ہے

ادب اور فن پر ان کی نگاہیں عقابی تھیں۔ان کی شاعری میں زندگی کی تمام حرکی قوتوں کا احساس ملتا ہے۔انھیں ابراحسنی گنوری جیسے ماہر فن اور استاد کی شاگردی حاصل رہی ہے اس لیئے ان کی شاعری میں ایک الگ رکھ رکھاؤ اور نظم وضبط قائم ہے جو انھیں دوسرے شعراء سے متمائز کرتا ہے۔آمر صدیقی نے نئے نئے استعاروں اور ترکیبوں کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے۔

چمنیوں کا دھواں پی گیا آسماں
اور بھی ہو گیا سا نولا آسماں
اسے پڑھو تو نگاہوں کو بے وضو نہ رکھو
کتابِ عہد کا ہے اقتباس سناٹا

یہاں آسمان کا سانولا ہونا اوسناٹے کو کتاب عہد کا اقتباس تسلیم کرنا ان کی شعر فہمی، تخلیقیت اور بلند خیالی کا بہترین مظہر ہے۔ آمر صدیقی نے اپنے گردوپیش کے حالات پر گہری نظر رکھی ہے۔ آج ہر انسان دہشت زدہ ہے چاروں طرف خوف کا بازار گرم ہے۔ بچے اسکول سے گھر لوٹ آتے ہیں تب مائیں اپنا روزہ توڑتی ہیں۔ ہماری آنکھیں سب دیکھتی ہیں لیکن اظہار سے قاصر ہیں۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے۔ ہر طرف کرب، چیخ، ماتم، بے ایمانی، فریب کاری عام ہے۔ اپنی اپنی ذات کے خول میں لوگ سمٹے ہوئے ہیں۔ زندگی کی ان ہی سچائیوں اور تلخیوں کو آمر صدیقی نے اپنے شعروں میں سمیٹا ہے جو ماضی اور مستقبل کی مماثلت کے بغیر بھی ایک معنوی چادر لپیٹے ہوئے ہے۔

آنکھوں پہ مہربان ہے منظر لہو لہو
یہ کرب روشنی کا سموئے کوئی چراغ

نہ چشم دید گواہوں میں ہے کوئی موجود
نہ کچھ ثبوت دکھانے کو رہ گیا آخر

نظر پڑے بھی تو کہنا ہے کچھ نہیں دیکھا
اسی کا نام ہے شاہد سراب بینائی

دروازے پر ماں کا چہرہ کھل اٹھا
بچے گھر تک لوٹ آئے اسکولوں سے

آمر صدیقی ایک مشاق، تجربہ کار اور فکر انگیز خیالات کے مالک تھے۔ عروض و معانی اور شعری کائنات کا احترام انھیں باوقار بنائے رکھے گا۔ آمر صدیقی کی چند مخصوص غزلوں میں صوتی خوش آہنگی کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے لیکن لفظ و معنی کے بیچ جو رشتہ امتزاج ہے وہ محولہ اشعار میں دیکھ کر بہ آسانی ہم کہہ سکتے ہیں کہ آمر صدیقی لفظ وصوت کی اہمیت سے غافل نہیں بلکہ اسکی اہمیت کو مقدم سمجھتے ہیں۔ آمر صدیقی کی غزلوں میں سائنسی شعور کی کارفرمائی بھی متعدد جگہوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ یہ خود بھی سائنس گریجویٹ رہے ہیں اس لیئے دارالتجربہ کا عمل ردعمل بن کر شعر کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ مثال کے طور پر

جلتے توے پہ قطرۂ شبنم کی کیا بساط
تحلیل ہورہا ہوں میں کالی گھٹاؤں میں
امید کا ایک قطرہ جو تھرمس میں نہ ہوتا
صحرا میں بھٹکنا بھی مرے بس میں نہ ہوتا
آگ کب ہے جواب پانی کا
چھو کے دیکھ آفتاب پانی کا
رنگ بدلے نہ موسم اگر دھوپ میں
راکھ ہو جائیں جذبوں کے پر دھوپ میں
تھرتھراتی ہے سطح پانی کی
لمس کی آرزو ہوا میں ہے

آمر صدیقی کے یہاں زندگی کا سلوک مثل محبوبہ نہیں بلکہ Vamp کا ہے۔ آمر صدیقی ایک طرف جہاں اپنی انانیت خود پسندی اور خود اعتمادی کی ملی جلی کیفیت سے مملو کیفیات کو اشعار میں بھی پیش کرتے رہے وہیں دوسری طرف زندگی کے تئیں ان کا تلخ مشاہدہ بھی گام بہ گام نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

احسان کم نہیں ہے مسیحائے وقت کا
رکھتے ہیں ہم امید شفا کم بہت ہی کم
زندگی جیسے ہو بنجاروں کی شام
دور سے آتی ہوئی آوازِ دف
اوقات تاج و تخت ہے کیا مجھ سے پوچھیے
لوٹا ہے اس فقیر کو اک بادشاہ نے
اب ندی سوکھ چکی ہے تو خیال آیا ہے
ہائے کیا چیز یہ طغیانی جذبات بھی تھی

محولہ اشعار سے قطع نظر آمر صدیقی کے یہاں جہاں خارجی سطح پر مشاہدے کی آنکھ ثبت ہوئی ہے نادر استعارہ وتشبیہ سے بہتر اشعار خلق ہوئے ہیں جیسے۔

بھیڑ میں ہے خوف اتنا ہی اُسے
جس قدر کمزور تنہائی میں ہے
منصفی نے بھی موند لیں آنکھیں
بن گیا خوف کا نوالہ سچ
شجر امید کا بیگانۂ خاکِ نمو کب تھا
کٹا جو ایک بازو دوسرا بازو نکل آیا

آمر صدیقی کے پہلے اور آخری شعری مجموعے چراغ بولتے ہیں، سے ماخوذ اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک قدآور غزل گو ہیں۔

نادم بلخی

نام	:	سیّد محمد ابراہیم بلخی		
قلمی نام	:	نادم بلخی		
والد	:	فصیح الدین بلخی		
تاریخ ولادت	:	۱۶ر ستمبر ۱۹۲۶ء		
تعلیم	:	ایم۔اے		
ملازمت	:	پروفیسر، جی ایل اے کالج، ڈالٹین گنج (رٹیائرڈ)		
تصانیف	:	آغاز سحر۔	شعری مجموعہ	۱۹۶۱ء
		ذوقِ سفر۔	"	۱۹۷۹ء
		دوپہر کا دائرہ۔	"	۱۹۸۴ء
		تحفے۔	"	۱۹۸۵ء
		دھوپ میں صحرانوردی۔	"	۱۹۸۷ء
		نقطوں کا حصار۔	رباعیات	۱۹۸۸ء
		جیون درش۔	دوہے	۱۹۹۸ء
		چودہ طبق۔	نعتوں کا مجموعہ	۱۹۹۲ء
		میٹھی میٹھی بولیاں۔	دوہے	۱۹۹۴ء
		ضیائے عرفاں۔	نعتوں کا مجموعہ	۱۹۹۵ء
		باطنی ارتعاش۔	غزلیات	۱۹۹۶ء
		بچو آؤ یہ پہیلی بوجھیں۔	منظوم	۱۹۹۷ء
		ترلوک	ہائیکو	۱۹۹۸ء

نادم بلخی

نادمؔ بلخی سرزمین جھارکھنڈ کے ایک ایسے شاعر ہیں جو ادب کی مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی جولانیاں بکھیرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد محترم جناب فصیح الدین بلخی جو ایک بڑے مفکرؔ، ماہر عروض اور نقادؔ تھے، سے اکتساب فیض کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کے بگڑنے اور سنورنے میں اس کے گرد و پیش کے حالات کا اہم رول ہوتا ہے۔ انھوں نے جس خانوادے میں آنکھیں کھولیں وہ شعر و ادب سے شغف اور علمی دروبست پہ گرفت رکھنے والا علمی گھرانہ تھا جسکا ان کی پرورش و پرداخت پر گہرا اثر پڑا۔ نادمؔ بلخی کی وابستگی روایت، ترقی پسند اور عہد جدید تینوں سے یکساں رہی ہے اس لئے ان کی شاعری میں تینوں کی جھلک واضح طور پر نمایاں ہے۔ انھوں نے شاعری کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے رباعی، نعت، دوہے، ہائیکو، ماہیا، سانیٹ، کہہ مکرنی، غزلیں وغیرہ کافی تعداد میں کہی ہیں لیکن ان کا واضح چہرہ غزلوں میں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ نادمؔ بلخی نے تقریباً ۲۱ رکتابیں مختلف اصناف سخن پر لکھ ڈالی ہیں۔ جو انکی اردو ادب سے وابستگی اور ہمہ گیریت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تضاد لفظی سے پیدا شدہ ماحولیات کے شعری پیکر کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ اس ضمن کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

بے زبانی نے وہیں پائی زباں
لب کشائی کی جہاں بندش ہوئی

امن کی، اخبار میں سرخی ملی
شہر میں دنگوں کی جب سازش ہوئی

مرکز تخریب تھا نادم وہی
جس جگہ تعمیر کی کوشش ہوئی

چشم ظاہر جسے نہ دیکھ سکی
چشم باطن اسی کی شاہد ہے

قدر جس نے نہ کی کبھی میری
نام دل میں بسا اسی کا ہے
درحقیقت تھی عاجزی اسکی
لوگ سمجھے عزور تھا اس کا

محولہ اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام اشعار ایک منظم فارمولے پر محیط ہیں۔گمان سے ذرا بھی ہٹ کر نہیں ہے۔زبان کا ملنا اور لب کشائی کی بندش، امن کے ساتھ دنگے کا ذکر، تخریب کے ساتھ تعمیر، ظاہر کے ساتھ باطن، جفا کے ساتھ وفا، عاجزی کے ساتھ غرور ایسے الفاظ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی نفی کرتا دکھائی پڑتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ نادم بلخی اس نوعیت کے واحد شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی خیالات وتراکیب کا مظاہرہ کرتا ہے۔
ایک چھوٹی بحر کی مکمل غزل ملاحظہ کیجئے۔

آبادی میں رہتا ہوں
لیکن اک ویرانہ ہوں
آگے پیچھے میرے بھیڑ
پھر بھی تنہا تنہا ہوں
من میں ہوں اک شہر لئے
باہر باہر صحرا ہوں
خاموشی گویائی ہے
یہ مت کہنا گونگا ہوں
گھر ہے جھوٹ کی نگری میں
کیسے کہدوں سچّا ہوں
لمبے چوڑے ساگر میں
ٹاپو اک چھوٹا سا ہوں

قسمت بالکل سوئی ہے
لیکن میں خود جاگا ہوں
فردا جسکی ہے تعبیر
میں نادم وہ سپنا ہوں

درج بالا تمام اشعار میں اسی طرح کی ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ہے نادمؔ بلخی ہر شعر میں قاری کو چونکانے کی سعی کرتے ہیں۔ آبادی میں رہ کے ویرانے کا احساس، بھیڑ میں تنہائی کا کرب، شہر میں صحرا کا مجسمہ، خاموشی کا اظہار گویائی بننا، جھوٹ کی نگری میں صداقت کی موت، لمبے چوڑے ساگر میں چھوٹے ٹاپو کا ہونا۔ قسمت کی خوابیدگی پر خود کو بیدار رکھنا، تعبیر کو سپنا ہونا بالکل متضادی کیفیات ہیں جس پر قاری واقعی کچھ ساعت کے لئے ہی سہی لیکن چونکتا ضرور ہے۔ بات الفاظ کی تراکیب کے حوالے سے چل رہی ہے تو ایک اور امر کا خلاصہ ہوتا ہے کہ انھوں ہندی الفاظ اور غیر مروجہ الفاظ کو بھی اپنے اشعار میں بڑی سلیقگی سے برتا ہے یوں کہئے کہ انھیں زندگی بخشی ہے۔ چند مثالیں بطور حوالہ پیش کرر ہا ہوں۔

نیند سے جسکی ہیں ماتی آنکھیں
شام تا صبح جگا بیٹھا ہے
دھوپ اوڑھے میں ہوا جب سر بلند
آبلہ پائی لئے انعام آئی
لوبھ کی ماری ہوئی چڑیا تھی وہ
دیکھ کر دانے جو زیر دام ہوئی
نادم محافظوں کی جو صف میں کھڑا ملا
میرے لہو میں ہاتھ وہی سانتا بھی ہے

محولہ اشعار میں ماتی آنکھیں، دھوپ اوڑھے، لوبھ کی ماری، سانتا بھی ہے جیسے الفاظ بالکل گھریلو اور عام بول چال کے لگتے ہیں اسطرح کے لفظوں کو برتنے سے اکثر شعری حسن مجروح ہو جاتا ہے لیکن

نادم بلخی نے پر اعتمادی کا ثبوت دیتے ہوئے ان الفاظ سے ہی شعری عظمت کو دوبالا کیا ہے۔ ماتی کی جگہ بوجھل کا بھی استعمال کیا جاسکتا تھا لیکن یہاں پر لفظ ماتی نے شعر کو Emphatic بنادیا ہے جس سے شعر کی صداقت کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں دھوپ کا اوڑھنا بالکل تازہ اور نیا استعارہ ہے۔ لوبھ کی ماری ہوئی چڑیا کہنے سے قاری کو اپنے ذہن پر شعر کے مفہوم سمجھنے میں Extra effort لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مضمون بالکل صاف اور آسان ہو جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں لہو میں ہاتھ کو سانا نادم بلخی کے برملا اظہار کا نمونہ ہے۔ چونکہ جھارکھنڈ کی اہم غزلیہ شاعری کو پیش کرنا مقصود ہے اس لئے میں نادم بلخی کے ان اشعار پر خصوصی طور پہ توجہ دینے کی کوشش کروں گا جن میں بھرپور شعری غنائیت اور عصری حسیّت موجود ہے۔ نادم بلخی کا ایک غزلیہ شعری مجموعہ "باطنی ارتعاش" کے نام سے میرے پاس موجود ہے اس کتاب کی سن اشاعت ۱۹۹۶ ہے اور اس عہد میں لکھی جانے والی معاصر غزل پر اگر دھیان مرکوز کرتے ہیں۔ تو پاتے ہیں کہ وہ سارے موضوعات جو شعری مبادیات بن سکتے تھے اسے انتہائی فنکارانہ ڈھنگ سے نادم بلخی نے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس شعری مجموعے کے نام کی معنویت پر ہی اگر ذہن کو مرتکز کریں تو ایک نادر استعارے کی پیشکش سے ہمیں روبرو ہونا پڑے۔ اس استعارے سے ہم نادم بلخی کے ذہنی کیفیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آج کی نئی غزل جو دودہے قبل جدید کہی جاتی تھی اس کے غالب رجحانات میں تنہائی، اداسی، بے یقینی، اضطراب اور انتشار پسندیدہ موضوعات بن کر اشعار میں ڈھل رہے تھے۔ نادم بلخی کا ذہن تاخیر سے ہی سہی شعر و ادب میں ان رویوں کو فراموش نہیں کر سکا یہی وجہ کر ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۰ تک کی جدید غزلیہ شاعری کے فضلے ان شعراء کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جنھیں احساس ہوا کہ جدیدیت خام خیالی نہیں ایک حقیقت ہے۔ اس کے پیچھے معاشی، سیاسی، سماجی، تہذیبی عناصر کی ایک ساتھ بدلتی ہوئی صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کا جو فطری جذبہ تھا وہ محرک بن کر ادب میں خصوصاً غزل میں رواں دواں ہوتا چلا گیا۔ نادم بلخی نے اپنے شعور وادرک سے یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کی کہ نئی غزل نئے مسائل سے دو چار نہیں بلکہ تبدیلی اس کی بنیادی ضرورت ہے مذکورہ خیالات کو قارئین غزل کے سامنے رکھنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ نادم بلخی ایک ایسے باصلاحیت، نبّاض اور منفرد غزل گو شعراء کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی غزلیہ شاعری کے باب میں ازسرنو قدر و قیمت واضح کرنے کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ نادم بلخی نے اپنی پسماندگی کو بھی کیا لطف اعزاز بخشا ہے۔

ہوں تھکا ہارا مسافر تری منزل کا مگر

دیکھ کر چھاؤں سر راہ نہ بستر کھولا

محولہ شعر کو پڑھنے کے بعد غالبؔ کا وہ شعر ذہن میں کوندنے لگتا ہے جس میں بے پناہ خود اعتمادی کا مظاہرہ اور کشمکش کی فضا ملتی ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہ گزر کو میں

نادمؔ بلخی کی مسافت جاری ہے۔ لمحاتی چھاؤں کو دیکھکر بستر کھولنے میں فوری طور پر منہمک ہونا ان کی سرشت میں داخل نہیں یہ اور بات کہ یہ تھک ہار چکے ہیں۔
نادمؔ بلخی کی قادر الکلامی کے قائل ہزاروں ہیں۔ اردو فارسی، ہندی کی لفظیات کا برمحل فطری استعمال ان کو ممتاز بناتا ہے۔ زندگی کو مختلف دانشوران نے مختلف زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ زندگی کے موجود اور غائب ہونے، اس کے پھر اچانک بہروپ ہونے کا سوانگ رچنے اور پھر حیرت آمیز مسرت سے دوچار کرنے کی جو روش ہیں اس پر جان و دل سے فریفتہ ہونے کا سامان آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ نادمؔ بلخی نے بھی زندگی کا مشاہدہ قریب سے کیا ہے۔

مجھے زیست جو بے مثالی ملی

سہاگن لئے گو دخالی ملی

اب میں نادمؔ بلخی کی ذہنی کیفیت کی طرف آتا ہوں جہاں عصری حسیّت سے مملو اشعار کہے گئے ہیں۔

ہر شب شب تاریک ہے آسیب کی ماری
اور گھر یہ عالم ہے کہ گھر کاٹ رہا ہے
خفاش پرندوں میں ہے اک ایسا پرندہ
اڑنے کو جسے دن میں بصارت نہیں ملتی

اس کے بانی ہیں فقط وہم وگماں
درمیاں جو آہنی دیوار ہے
پھول مرجھا کے بھی رکھتے ہیں جو پھولوں کی سرشت
ان کی خوشبو کبھی باسی نہیں محسوس ہوئی

نادمؔ بلخی کی غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں وہ گاگر میں ساگر کی معنویت کو آشکار کرتی ہیں۔نادمؔ بلخی کی مشاقی کے نمونے جابجا بکھرے پڑے ہیں۔جہاں جہاں انھوں نے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے وہاں صوتی آہنگ مجروح نہ ہوکر پروقار ہوگیا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار بطور حوالہ پیش کر رہا ہوں۔

نادم کیوں پھیلتا ہے دکھ
میں نے تو سکھ بویا تھا
ناواقف سنگیت سے
اترایا جو راگ پر
باغ باغ پت جھڑ ہے
کیف سے فضا خالی

جس شاعر کو گھر سے باہر قدم رکھنے پر شہر کا بازار بے چہرگی کی بھیڑ میں گھٹتا ہوا دکھائی دے۔ذہن کے خالی ہونے پر گھر بھرا لگے۔چھاؤں کی ہوس میں پریشانی کے سبب، دھوپ میں عمر کے مختصر ہونے کا گمان گذرے اس کی بالغ نظری کے کیا کہنے۔حتمی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نادمؔ بلخی اردو غزل میں اپنی موجودگی کا احساس کرانے میں کامیاب ہیں۔

راشد انور راشدؔ

نام	:	راشد انور
قلمی نام	:	راشد انور راشدؔ
والد	:	انوار الغنی
تاریخ ولادت	:	۲۷ نومبر ۱۹۷۱
جائے ولادت	:	رانچی (جھارکھنڈ)
تعلیم	:	ڈاکٹریٹ (جے این یو، نئی دہلی)
مشغلہ	:	درس و تدریس
تصنیفات	:	(۱) مجروح سلطانپوری۔ ایک مطالعہ (تنقید) ۱۹۹۹ء
		(۲) ادب کے تعلق سے (تنقید) ۱۹۹۹ء
		(۳) فنون لطیفہ (فائن آرٹس) ۲۰۰۰ء
		(۴) نئے افسانے کا معنوی استعارہ (ترتیب) ۲۰۰۲ء
		(۵) شعور نقد (تنقید) ۲۰۰۳ء
		(۶) علقمہ شبلی (ترتیب) ۲۰۰۴ء
		(۷) وہاب اشرفی (ترتیب) ۲۰۰۵ء
تراجم	:	(۱) سبھاش چندر بوس - ۲۰۰۱ء
		(۲) ہندوستان کی کہانیاں - ۲۰۰۱ء
		(۳) پیڑ پودوں کی حکایت - ۲۰۰۳ء

شعری مجموعہ	:	شام ہوتے ہی (زیرترتیب)
ادارت	:	(۱) سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۵ء
		(۲) اثبات ونفی (کولکاتہ) ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۰ء
ایوارڈ	:	(۱) ٹاپرز ایوارڈ۔ دہلی اردو اکیڈمی ۱۹۹۴ء
		(۲) دارجلنگ کلا پرشید ایوارڈ ۱۹۹۸ء
		(۳) دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۹۹ء
مستقل پتہ	:	اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ، چونا بھٹہ، پوسٹ جی پی او، رانچی نمبرا (جھارکھنڈ)
حال مقام	:	شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲ (یوپی)

راشد انور راشد

رانچی کی جن اہم شخصیتوں نے شعروادب میں تیزی سے اپنا مقام بنایا ہے ان میں ایک نام جو حالیہ برسوں میں مزید شہرت کا مالک بنا ہے وہ راشد انور راشد ہے۔ دہے کی تقسیم اگر کی جائے تو اس لحاظ سے راشد ۹۰ کے آس پاس اپنا شعری سفر شروع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی طالبعلمی کے زمانے سے ہی شعر و نقد کے میدان میں مخصوص پہچان بنانے والے راشد انور راشد نے جسطرح اپنے کیریئر کے تئیں سنجیدگی سے یکے بعد دیگرے منصب اعلیٰ پر فائز ہونے کا شرف حاصل کیا اسی طرح تخلیقی سرگرمیوں کے لحاظ سے بھی ان کے کارنامے جگ ظاہر ہیں۔ راشد ذہین اور متین ہونے کے ساتھ ساتھ شعروادب کے بدلتے تیور اور رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے شعروادب کو اپنی ذہنی وابستگی کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف بھی پیش قدمی جاری رکھی۔ ملک کے نامور درس گاہوں میں ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے استاد کی حیثیت سے بحیثیت لیکچرر تقرری پالینا ہی کم چیلنج کی بات نہیں ہے۔ جس منصب کو نئی غزل کے منفرد لہجے کا شاعر اسعد بدایونی ذریعہ عزّت سمجھتے رہے ہوں وہاں راشد نے اپنی پروقار موجودگی کا احساس دلا کر یہ ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ

بس مرا جوش جنوں اپنے سلامت رکھنا
پھر اسی خاک سے اٹھینگے اگر خاک ہوئے

راشدؔ انور راشد کا جوش جنوں خود انھیں کے شعر کے ہیولے سے تیار کیمیا گری کا نمونہ ہے۔ راشد انور راشد کے تئیں میرا ذاتی طور پر خیال ہے یہ شخص عزم محکم اور جوش جنوں کی آمیزش اختیار کر کے مخالف سمت کو اپنی طرف رجوع کرنے کی لیاقت رکھتا ہے۔

راشد اپنی زندگی میں قدم قدم پر مخالف اور سازشی ذہنیت کا شکار ہوتے رہے ہیں لیکن چونکہ اپنے فہم وادراک پر انھیں بھروسہ ہے اس لئے بجا طور پر کہتے ہیں۔

منافقین کی سازش تو پھر عروج پہ تھی
مگر وہ فیصلے حق میں مرے برا نہ ہوا

راشدؔ کی سوچ کی کائنات وسیع ہے۔ جن معاملات کو وہ فراموش کر دل کو تسلی دے کر خوش تھے اس پر ازسرِنو غور کرنے پر حقیقت اسی طرح کھلتی نظر آتی ہے۔

اب اپنی چھوٹی سی دنیا میں میں بہت خوش ہوں
اسے تو دل سے بھلائے بھی اک زمانہ ہوا

راشدؔ کی شاعری پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کے اسباب وعلل کا پتہ لگایا جائے۔ یا پھر اس خمیر کو تلاش کی جائے جس سے ان کی غزلوں میں پیکر تراشی کا رجحان نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ راشد نے مطالعہ مشاہدہ سے منظوم کو فکری وفنی التزام کا ایک تسلسل قرار دیتے ہوئے اپنی راہ آسان بنائی ہے۔ راشد کے یہاں کبھی کبھی مشاہدہ مطالعہ کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مطالعہ مشاہدے کے ساتھ۔ اس کی لازمی شرط یہ ٹھہری کہ راشدؔ شعری تخلیق کے لئے دونوں طرح کے لوازمات تک رسائی ضروری سمجھتے ہوئے شعری سفر طے کرتے ہیں۔

دشت تو سب کے رگ و پے میں ہے لیکن مجھ سا
خاک اڑانے کا سلیقہ کوئی ایجاد کرے

خاک اڑا کر دشت کی تخلیق کرنے کا سلیقہ دوام اور اس کا رشتہ رگ و پے سے جوڑنے کا اہتمام اگر شاعر میں ہو تو شاعر کی طبیعت کی زرخیزی کے کیا کہنے۔ راشد انور راشد کے یہاں شعری ٹریٹمنٹ کی ایک منفرد تصویر جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔

جدیدیت، مابعد جدیدیت کے جھمیلے میں نہیں پڑتے ہوئے جن چند شعراء کے یہاں بھرپور شعری تخلیق کا جواز آسانی سے فراہم ہوتا ہے ان میں راشد انور راشد بہت دور سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ راشد کے یہاں داخلیت اور خارجیت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم بن گئے ہیں۔

مزید یہ کہ اپنی ذات سے ان کا واسطہ پیدا کرنا پھر نتیجہ اخذ کرنا قارئین کے لئے محظوظ ہونے کے لئے دلچسپ فضا پیدا کرنا، ان کی شعری کاریگری کی مثالیں ہیں۔

راشد شعر وادب کی دوسری اصناف میں بھی اپنے کمالات کا جوہر دکھلاتے رہے ہیں۔ تنقید میں انھوں نے اپنی صلاحیت کا اعتراف بہت پہلے ہی کرا لیا ہے۔ جدید غزل سے روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا گذشتہ سے پیوستہ جیسا تعلق قائم ہے۔ جب تک ہمیں روایت کے شجر سایہ دار کے نیچے رہنے کی توفیق حاصل نہ ہوگی ترقی پسندی کے معقول جواز فراہم ہونے کی صداقت پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح جدیدیت اور صالح جدیدیت کے بیچ بھی فیصلہ کن تفریق نہیں پیش کی جا سکتی۔ راشد نے زمانۂ ماضی کی سدابہار روایتوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہیں ترقی پسند خیالات کے اسباب وعلل کی بھی چھان پھٹک کی ہے۔ اسی کے نتیجے میں جدید شعری رجحان کے سائے تلے راشد کا شعری سفر طے ہوا ہے۔ جدید شعری رجحان میں بھی ان صالح قدروں کی پذیرائی کی ہے جس سے ادب لائق توقیر واحترام ٹھہرتا ہے۔ راشد نے حالانکہ جدیدیت کے احوال وواقعات کا مشاہدہ عہد رفتہ کے دور میں نہیں کیا ہے لیکن آثار وقرائن کی موجودگی سے جو نتیجہ اخذ کیا وہ مستحسن کہا جا سکتا ہے۔ رشتوں کے زوال، عدم موافقت، لمحے کی بے بضاعتی، انتشار وخلفشار، بدامنی، فنائیت، حیرت ناکی خوش منظری، احساس تنہائی، بے رشتگی، وغیرہم کچھ ایسے موضوعات ہیں جو جدیدیت کی اساس قرار دیئے گئے ہیں ان سے راشد کا ذہنی طور پر وابستگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ درج ذیل اشعار حوالے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں جنکے مطالعے کے بعد رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔

میرے اندر سے اٹھی بپھری ہوئی موج فنا
جس کو ہو خود پہ بھروسہ وہ مقابل ہو جائے

تمام رشتے فراموش کر دیئے تو نے
تعلقات سے اب فائدہ نہیں ہے کیا

نشہ سا چھانے لگا وادیوں میں پلنے کا
اب انتظار ہے بس برف کے پگھلنے کا

یہ خبر دی ہے پرندوں نے چلو سنتے ہیں
جھیل کے پاس کوئی گیت سناتی ہے ہوا

دن کے ہنگامے سے اور رات کی تنہائی سے دور
اپنے حصے میں کہیں ایک حسیں شام تو ہو

جب کہ اس موڑ پہ پھر مجھ سے بچھڑ جانا تھا
لمحۂ یاس میں امید جگائی کیوں تھی
نور آنکھوں سے چھنا دیدۂ تر خاک ہوئے
ہائے کیا لوگ تھے دوران سفر خاک سوئے
اپنی آنکھوں کی ندی سوکھ چکی ہے شاید
اشک بھی ساتھ نہ دے پائے جو رونا چاہے

راشدؔ نے گذشتہ سے پیوستہ کے باب میں برملا طور پر اظہار کیا ہے کہ اس کا جس عہد سے رشتہ استوار ہے اس کی گونج شہر سے نکل کر جنگل میں بھی پھیل چکی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راشد انور راشد کا رشتہ بیک وقت ظاہری و باطنی دروبست سے متعلق ہے۔

اب تو ہر گذرا ہوا پل بھی صدا دینے لگا
مجھ سے جب بچھڑا تو جنگل بھی صدا دینے لگا
تجھے بھی وادئی ہونے قبول کر ہی لیا
اب اپنے آپ کو پھر سے پکار چاروں طرف

راشد انور راشدؔ کی شاعری کا جو تیور ہے اسے طویل ترین مشق سخن کی ضرورت اگر درکار رہے گی تو یہ اپنے لہجے کی دریافت میں پریشانی سے بچ جائیں گے۔ راشد کے یہاں اشعار میں ایک صفت ایسی ہے جو خصوصیت ذکر کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ ان کا لہجہ سپاٹ نہیں ہے۔ ان کی طرز ادائیگی میں ایک ایسی بے ساختگی ہے جو مخاطب سے صلۂ تکلم چاہتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار کو اگر نگاہ میں رکھیں تو راشد کے شعری مزاج کی پہچان بہ آسانی ہو سکتی ہے۔

اجاڑ دشت بھی گلزار میں بدل جائے
یہاں بھی آ کے اگر زندگی قیام کرے
بہار جھوم کے آئی شجر میں پھول کھلے
چلو دعا یہ کریں ہر نظر میں پھول کھلے

بھٹک رہے تھے ہم اس کی تلاش میں کب سے
مگر جو لوٹے تو دیکھا شجر میں پھول کھلے

ظلم، بربریت، تشدد، کے خلاف ہر ذکی الحس شاعر چیخ اٹھتا ہے۔ راشدؔ کے یہاں بھی سماجی ناہمواری کے خلاف احتجاج کی لئے میں شدّت ہے جوان کے شعری لہجے کے عین مطابق ہے۔ حوالے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

زبان میں نے جو کھولی تو سب ہیں ششدر کیوں
ترے خلاف کوئی بولتا نہیں ہے کیا
یہ کیسے مان لوں میں ہر طرف سکون ہے اب
کہ پچھلی رات ہی اک حملہ قاتلانہ ہوا
احتجاج آنکھوں میں یوں دفن رہے گا کب تک
ایک ہنگامہ کسی روز سر عام تو ہو
سب کی زبان تراش لی ظالم نے اس لئے
ہر فرد سن رہا ہے کوئی بولتا نہیں
ایک آزاد پرندے کی طرح ہوں میں بھی
لو سنبھالو یہ درو بام نہیں لیتا میں

راشدؔ کے یہاں بحروں کے انتخاب میں انفرادیت نظر آتی ہے۔ نئی زمین میں شعر کہنا اپنی وضع کردہ شعری تراکیب سے نئے معنوی افق کو روشن کرتے ہوئے مدلّل مضمون باندھنا راشدؔ کی طبیعت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مزاج میں شگفتگی کے باعث شعر کو پر لطف بنانے میں راشدؔ لاشعوری طور پر بہترین تخلیق خلق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بہشت باغ سے آئی ہے کوئی سبز پری
اسی لئے ہے فضا میں نکھار چار طرف
اے کاش ننھے ہاتھ کا ملتا مجھے بھی لمس
افسوس اے نصیب کھلونا نہیں ہوں میں

مجموعی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ راشدؔ جھارکھنڈ کے ایک شگفتہ لہجے کے شاعر ہیں۔

شائق مظفر پوری

نام	:	سیّد معین احمد
قلمی نام	:	شائق مظفر پوری
ولدیت	:	ڈاکٹر سیّد آل رسول مرحوم
پیدائش	:	۱۷/مئی ۱۹۳۹ء
جائے پیدائش	:	خواجہ چند، چھپرہ
پیشہ	:	ملازمت ٹسکو (رٹیائرڈ)
تعلیم	:	میٹرک
تصانیف	:	نیا سورج۔ شعری مجموعہ۔۱۹۸۳
	:	سفر لہجے کا " ۲۰۰۳
تخلیقی سفر کا آغاز	:	پہلی غزل کی اشاعت۔۱۹۶۱
مکمل سکونت	:	مکان نمبر ۱۱۹، اولڈ پرولیا روڈ، ذاکر نگر، جمشید پور

شائق مظفر پوری

شائق مظفر پوری جمشید پور کی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے شعروادب میں بہت سے خوشنما گل بوٹے کھلائے ہیں۔ان کی شاعری کا سفر چھٹے دہے سے شروع ہوتا ہے۔ابتدا سے ہی ان کی شاعری میں ایک نپا تلا انداز اور خوش سلیقگی نمایاں ہے۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ادب کی خدمت کو اپنا فرض اول سمجھنے والے اس شاعر نے کبھی بھی سستی شہرت کی خاطر ایسے حربے اختیار نہیں کئے جو آج ادب میں رائج ہے۔'نیا سورج' اور 'سفر لہجے کا' ان کے دوشعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں ان کی شاعری سے متعلق میں ان شعراء وادبا کی آرا سے اتفاق نہیں کرتا جو یہ کہتے ہیں کہ شائق کے یہاں جدّت طرازی کے نمونے دیکھنے کو نہیں ملتے۔میں ان کی شاعری کے حوالے سے عہد حاضر کے صف اوّل کے مفکر ونقاد جناب وہاب اشرفی کی رائے کو بطور سند تسلیم کرتا ہوں ان کا کہنا ہے کہ ''میں انھیں بانی کے اسلوب کا شاعر کہتا ہوں۔میں بانی کو جدید غزل گویوں میں بڑا اہم مرتبہ دیتا ہوں'' وہاب اشرفی کبھی ایرے غیرے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔وہ ایک پارکھی نظر رکھتے ہیں ان کے یہ ارشادات کسی رشتے اور مجبوری کی بنا پر نہیں ہو سکتے بلکہ گہرے مطالعہ کے بعد یہ اطلاق ان پر صادر ہوا ہوگا۔بانی کی شاعری کا اپنا لب ولہجہ ہے،اپنی شناخت ہے۔شائق مظفر پوری کو اس قبیل کا شاعر تسلیم کرنا بڑی بات ہے۔شائق مظفر پوری کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ اپنے طرز کے منفرد شاعر ہیں جنھوں نے کسی عہد کا اثر قبول نہیں کیا جبکہ انھوں نے ترقی پسند دور میں اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔شائق کی شاعری کلاسیکی آہنگ سے مربوط ہے ان کے کلام میں شائستگی اور روانی ہے۔ان کی شاعری میں دور حاضر کی نوحہ گری اور زبردست مشاہدے کا عکس نمایاں ہے۔پروفیسر قمر رئیس کا خیال ہے کہ ''غزل ان کے اظہار کا اساسی میڈیم اس لئے بن گئی کہ وہ فن شاعری کے کلاسیکی آہنگ سے جبلی طور پر قریب رہے ہیں'' شائق مظفر پوری نے اپنی شاعری کو ہمیشہ بوجھل ہونے سے بچائے رکھا ہے۔الفاظ وبیان میں دانستہ ثقالت بھرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا حق ادا کیا ہے۔شائق کے یہاں احساس کی حدّت،فکر کی عروجیت،ارضیت پسندی دیکھتے بنتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اشعار قابل تعریف ہیں۔

کون شائقؔ دیکھتا ہے آئینہ
کون ہے جو خود سے شرماتا نہیں
ترے حضور میں پہنچے تو حال کیا ہوگا
جو آئینے میں ابھی شرمسار اتنا ہے

محولہ اشعار میں شاعر نے انسان کے ضمیر کی بولتی تصویر کو پیش کیا ہے۔ انسان زمانے سے کم خود سے زیادہ شرمسار ہوتا ہے لیکن قلب پر بے حسی کی چڑھتی ہوئی دبیز چادر ان اضطرابی کیفیت کو چھپانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائے۔

یہ میرا ظرفؔ کہ پیتا ہوں زہر خاموشی
ضمیر ہے کہ الگ امتحان چاہتا ہے

شائقؔ مظفر پوری کی فکری جہت انھیں دنیائے شعر و ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ آج کا انسان جس عہد صارفیت میں سانسیں لے رہا ہے وہ سود و زیاں کا حساب کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔

ڈھونڈتے ہیں لوگ مطلب کا سراغ
ٹوٹ کر ملنا بھی اب اچھا نہیں

انسان کی فطرت میں عیاری کا عنصر اس درجہ تک غالب ہو گیا ہے کہ اب مخلصانہ رویّے کو تصنع اور مفاد پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ کوئی کسی سے بلاغرض نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو لوگ اسے بھی اسی زمرے میں شامل کر دیتے ہیں۔

شائقؔ مظفر پوری کی شاعری انسانی کیفیات کا مظہر ہے وہ انسان کی رگِ ظرافت چھو کر اس کی نفسیات کی گرہوں کو کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنگئ وقت نے انسان کی فعالی قوت کو حد درجہ بڑھا دیا ہے وہ ہر کام خواہ اس کے بس کا ہو یا نہ ہو کر گزرنا چاہتا ہے۔

پرند وقت سے پہلے اڑان چاہتا ہے
زمیں کا اہل نہیں، آسمان چاہتا ہے

درج بالا شعر میں بے صبرئی آدم، لاشعوریت اور قبل از وقت منزل مقصود کے حصول کی اضطرابیت کو شائق مظفر پوری نے بڑے حسین پیرائے میں اظہار کیا ہے جبکہ حق یہ ہے کہ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن تقاضۂ فطرت بغیر آسمان کی زمین چاہتا ہے۔ درج محولہ شعر ''جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا'' کا مصداق ہے۔ کم جاننے والا شخص اپنی نمائش زیادہ کرتا ہے۔ جسے چلنا نہیں آتا وہ ریس جیتنے کی بات کرتا ہے۔

شائق مظفر پوری کی شخصیت ایک انجمن ہے انھوں نے خود کو گروہی تصادم سے پاک رکھا۔ ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان حضرات نے اپنے استاد شائق مظفر پوری کے نام کی مناسبت سے ایک ادبی ادارہ ''شائقین ادب'' قائم کر رکھی ہے جس میں شہر کے سبھی ادبا شعراء بلا امتیاز شریک ہوتے ہیں۔ شائق نے اپنے شاگروں کے کلاموں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی پردہ داری بھی قائم رکھی ہے جبکہ آج کے استاد ڈھنڈورا پیٹ کر اس امر کا اعلان کر ڈالتے ہیں کہ فلاں شخص میرے تصرّف میں ہے۔ محترمہ انوری بیگم کی کتاب ''شائق مظفر پوری فکر و فن'' میں شائق صاحب کے شاگردوں کی فہرست دیکھکر میں ششدر رہ گیا کہ ان میں سے بیشتر شعراء استاد زمانہ کہلاتے ہیں جبکہ وہ ابھی بھی شائق مظفر پوری کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں۔

اس لئے تو شیشۂ دل میں اتارا ہے تجھے
تیرا پردہ بھی سلامت اور ہم دیکھا کریں

شائق مظفر پوری کی شاعری ابہام و اہمال سے پاک ہے۔ ان کی شاعری میں لاسمتیت اور ناتکمیلیت کا احساس جابجا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ اس احساس کا اظہار درج ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

کمی کے دائرے میں سب کھڑے ہیں
کوئی انسان مکمل ڈھونڈ تا ہوں
کون سی منزل پہ ٹھہرے کیا خبر
بے ارادہ چل رہی ہے زندگی
گماں ہوتا ہے ہر منزل پہ جاکر
کوئی منزل ہے اس منزل سے آگے

ڈاکٹر انوری بیگم کے ارشادات شائق مظفر پوری کی شاعری کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں "شائق مظفر پوری بوقلموں جذبات وخیالات کی مکمل تصویر ہے انھوں نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا اس کے ساتھ انصاف کیا۔ ہر قسم کے مضامین کی ترجمانی، صفائی، شستگی اور پاکیزگی کے ساتھ کی۔ ظاہری نقوش ابھارنے کی بھرپور کوشش کی مگر لطف اندوزی پر فکر کو قربان نہیں کیا بلکہ بڑی مشاقی اور قادرالکلامی سے اپنا مطمح نظر پیش کیا۔"

شائق مظفر پوری کے بیشتر اشعار دکھتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتے ہیں جہاں یاسیت، محرومی، اداسی اور افسردگی نے اپناڈیراڈال رکھا ہے وہاں شائق انھیں زندگی فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔

سورج سے اتفاق کی صورت نکالئے
کیا کیجئے گا سایۂ دیوار دیکھکر

مجھے مشکوک نظروں سے نہ دیکھو
مرا ظاہر پس دیوار بھی ہے

غم نہیں شائق اگر ہے تیرگی چھائی ہوئی
اپنا مٹی کا دیا کچھ ضیا دے گا مجھے

اگر تو ساتھ میرا دے تو شائق
کہاں ہے زندگی چل ڈھونڈتا ہوں

مرا نہیں ہے تو اک دن ضمیر جاگے گا
صدا لگائے گا بوڑھا فقیر جاگے گا

شائق کی شاعری عصری حسیت کی جلوہ سامانیوں سے مزّین ہے انھوں نے اپنی چشم بصیرت سے دنیا کے گردونواح کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ موسیقیت انکے شعری حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کے شعری تیور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اب آئینے میں سنورنے لگا ہے وہ شائقؔ
تری پسند کا کتنا خیال رکھتا ہے

سیاہ رات کی چادر مسکنے والی ہے
بجھے بجھے سے قبیلے کا میر جاگے گا

آنکھوں کو انتظار کے لمحے پسند ہیں
ہر اک حسین خواب کا منظر سمیٹ لو

آئینہ دکھا تا ہے میری فکر کو شائقؔ
میرا ہی قلم میرا طرف دار نہیں ہے

کہاں اڑان تھی لیکن کہاں دھیان گیا
نظر زمیں پہ ڈالی تو آسمان گیا

پتھروں کی خامشی کا جائزہ لیتا ہوں میں
لوٹ کر آتی ہے جب میری صدا میری طرف

چڑھی ہوئی ہے وقت کی کمان پھر
کہیں سے سرخ ہوگا آسمان پھر

زمین اتنی کھسکتی جا رہی ہے
قدم جتنا جمانا چاہتا ہوں

سرور ساجد

نام	:	غلام سرور خان
قلمی نام	:	سرور ساجد
ولدیت	:	محمد زین اللہ خان
پیدائش	:	۱۵؍فروری ۱۹۶۴ء
جائے پیدائش	:	رانچی
تعلیم	:	ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی
مشغلہ	:	درس وتدریس۔ پی۔جی اردو ڈیپارٹمنٹ، رانچی یونیورسٹی
تصانیف	:	۱۹۶۰ کے بعد کی غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ ۱۹۹۴ء
		عہدنامہ کے ۱۲ شماروں کی ترتیب ۱۹۹۸ سے ۲۰۰۰ تک
ادارت	:	سہ ماہی عہدنامہ۔ رانچی
پتہ	:	نظیر خاں لین، مین روڈ، رانچی۔ نمبر۱

سرور ساجد

جدیدیت کے تین اہم شعراء جن کے اسمائے گرامی پرکاش فکری، صدیقی مجیبی اور وہاب دانش ہیں، شہر رانچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ان حضرات نے آنے والی نسل پر براہ راست اور غیر براہ راست طور پر گہرا اثر ڈالا ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کچھ حضرات طبعی طور پر شعروادب میں داخل ہوتے ہیں اور کچھ کسب کر کے درادب پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ان دوطرح کے شعرامیں طبعی طور پر شاعری کو جلا بخشنے کی جو مساعی کرتے ہیں انھیں فطری طور پر منزل قریب دکھائی دیتی ہے۔رانچی کی نئی نسل کے ایسے ہی شعراء میں سرور ساجد کا شمار ہوتا ہے سرور ساجد کا روایت سے رشتہ استوار ہے ترقی پسندی کے عروج وزوال کے زمانے کو مطالعہ سے پرکھ کر جدیدیت کی نفسیاتی تشریح کو شعروں میں برتا ہے اور مابعد جدید کی غیر مشروط کھلی فضا میں سانس لینے کا بھی اہتمام کیا ہے۔سرور ساجد نے اپنے پیش رووں سے جو کچھ سیکھا ہے اسے اپنے شعور و وجدان سے ہم آہنگ کر شاعری کی ایک منور فضا تشکیل کی ہے۔ان کے یہاں ادب برائے ادب جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی کرنے کی خو سے نتیجہ برآمد کرنے کا عمل اور پھر رد عمل چہرۂ معنی روشن کرتے ہیں۔ان کے یہاں ابہام اور تجریدیت نہیں ہے۔ہر شعر شفاف آئینے کی طرح ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ زمانے کا چہرہ مکروہ ہو کر بھی تابناک نظر آئے۔اچھی اور سچی شاعری کا وصف بھی یہی ہے کہ شعر سے آئینہ دکھانے کا کام لیا جائے سرور ساجد اس معاملے میں شاعر صادق ہیں۔روایتی شاعری پر ہی موقوف نہیں بلکہ جدید اور مابعد جدید سبھی طرح کے شعراء کے یہاں مبالغہ آمیزی سے ملتی جلتی ایک کیفیت ہمیشہ دیکھنے کو ملتی ہے۔جسے ہم خوش گمانی پر محمول کر سکتے ہیں۔سرور ساجد بڑی صفائی سے اپنے شعری لوازمات کی پیشکش کو سرمۂ بصیرت بنانے کا ہنر پیش کرتے ہیں۔اس ضمن میں درج ذیل اشعار کی نقل کرنا ان کے ذہنی پس منظر کو مربوط کرنے کے لئے کافی ہے۔

غم کو پردے میں یوں چھپا دوں گا
دل دکھے گا تو مسکرا دوں گا

میرا چہرہ بگاڑ نے والے
تجھکو تحفے میں آئینہ دوں گا

محبتوں میں نشہ تھا خمار ٹوٹا ہے
برا نہ مان مگر اعتبار ٹوٹا ہے

تو میرا ہو کے بھی میرا نہیں پر داد اسکی دے
کہ آخر نیم سے بھی شہد پیدا کرلیا میں نے

سورج ہزار صدیوں کا ہو جائے گا سیاہ
اس وقت اپنے لب کو مقفّل نہ کیجئے

مندجہ بالا اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سرور ساجد کے اشعار میں دبیز تہہ داری موجود ہے۔ معاملات زندگی میں رشتوں کا نباہ اور پھر اس سے پیدا تلخی ذکی الحس شخص کے لئے وبال جان ہے۔ غم کو پردے میں چھپانے کا ہنر اور دل دکھنے پر بھی مسکرانے کی مجبوری اور پھر اس کا برملا اظہار کئی زاویے سے سرور ساجد کی طبیعت کی بے چینی کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کی ازلی کمینگی اس کی مہذب پوشاک میں چھپی رہتی ہے۔ وقت جب امتحان لیتا ہے تو مذکورہ شخص جیب و دامن کی تمیز نہ کرتے ہوئے اپنی اوقات پر اتر آتا ہے۔ سرور ساجد چہرہ بگاڑنے کے عمل کو مخالف فریق کے غیر تعمیری نقطۂ نگاہ کی داد اسطرح دیتے ہیں کہ مخالف سرشار نہ ہو کر شرمسار ہو جاتا ہے۔ زمانی اور مکانی سلسلے نئی شاعری کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ انسان گھر میں گوشۂ عافیت ڈھونڈتا ہے دن کی بیداری کا ثمرہ نیند کی شکل میں اسے ملتا ہے۔ اسی نیند میں نامکمل خواب بھی دیکھتا ہے جسکی تعبیر دوسرے دن سورج کی آگ میں جھلس کر خاک نما ہو جاتی ہے ایسے میں سرور ساجد کا چیخ اٹھنا بامعنی ہے اسی لئے ان کی نوک قلم سے یہ شعر باہر آتا ہے۔

سلسلہ خواب کا تعبیر سے ملتا ہی نہیں
اب تصور سے انھیں نوچ کے پھینکا جائے

رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل بھی اب میکانکی انداز سے شروع ہو گیا ہے۔ گھر جائے عافیت کا

مظہر ہے اگر گھر ہی رشتے توڑنے لگے تو پھر آنگن کے بیچ دیوار کو بلند ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ سرور ساجد اچانک اظہار بے رشتگی پر چونک جاتے ہیں اوران کا لہجہ احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

عجیب ضد ہے یہ گھر توڑ دے گی رشتے بھی
وہ چاہے کوئی ہو دیوار مت اٹھانے دے

زندگی کو دھوپ چھاؤں سے تعبیر کرنے والے سرور ساجد سکھ دکھ کے لمحات کو اپنے ہی مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی جیسی نظر آتی ہے ویسی نہیں ہے۔ معاشرے میں نظم وضبط کے ساتھ زندگی گذارنے میں بہت سی دشواریاں ہیں لیکن یہی راستہ صحیح بھی ہے اس لئے سرور ساجد نے غیر یقینی صورت حال کی نمائش کرتے ہوئے کہا ہے۔

دھوپ کو تنگ جو کرنا ہو یہ حربہ رکھ لو
تم تصور میں کسی پیڑ کا سایہ کر لو

سرور ساجد کے یہاں سورج اور جگنو کا ذکر رسماً نہیں آیا ہے۔ سورج اور جگنو کی آفادیت واہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے شاعر نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا ہے۔ اس شعر میں طبقاتی کشمکش کے اظہار کے لئے سورج اور جگنو کے وجود کو مثبت زاویے سے پیش کیا گیا۔ شعر سے واحد متکلم غائب ہے ظاہر ہے کہ 'ہم' کا صیغہ اجتماعی خواہشات کا مظہر ہے۔

اب تم ہماری سوچ کو جو چاہے نام دو
سورج بھی ہم کو چاہئے جگنو بھی چاہیئے

سرور ساجد نے ایک غزل 'ترے حوالے سے' کی ردیف میں کہی ہے اور خوب کہی ہے اس غزل میں مخاطب اس کے روبرو ہے اور انداز پیشکش سے یہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ شعر میں بے تکلفی کی فضا دیدہ ودانستہ قائم نہیں کی گئی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اظہار اسی پیرائے کا محتاج تھا۔

تو اس کو مانے نہ مانے مگر یہی سچ ہے
کہ میں خود کو بھی دیکھا ترے حوالے سے
بہت سے خواب ملے ایک تیرے ہونے سے
بہت سی رنجشیں بے جا ترے حوالے سے
تو ساتھ ہے تو میں دنیا کو فتح کر لوں گا
یہ اعتماد ہے تنہا ترے حوالے سے
جو تو نہ ملتا تو بے صوت زندگی ہوتی
ہر اک سانس ہے نغمہ ترے حوالے سے

محولہ پوری غزل کی جو تخلیقی فضا ہے اس سے اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے کہ سرور ساجد کی یہ مخصوص لمحے کی قربت کا اشاریہ بن کر غزلِ مسلسل میں ڈھل گئی ہے اردو غزلِ مسلسل کی روایت بہت پرانی ہے۔ ہر شعر اکائی ہو کر بھی مربوط ہے۔ باقی نے اس میدان میں کئی معرکے سر کئے ہیں۔ آنے والی نسل نے اس عظیم شاعر کی اتباع کرتے ہوئے نئی راہ نکالی جس میں ایک نام سرور ساجد کا ہے۔ اس طرح سے تخلیقی قوت کا مظاہرہ کرنا اور اس سے شناخت قائم کرنا اس طرح کی تخلیق بہت دشوار ہے۔ غزل پر نیم وحشی صنف سخن ہونے کے الزام کی نفی کرنے کیلئے کافی ہے۔

ایک غزل جسکی ردیف ''رہ پائے گا'' ہے اس میں سرور ساجد نے ڈگر سے ہٹ کر رہ جائے گا کی ضرورت ہونے کے باوجود بہت اچھے اشعار کہہ گئے ہیں۔ اسی زمین میں متعدد شعراء کی غزلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن بقول حسن نعیم

اگر اڑان ہوا اونچی تو بر اعظم بھی
ہر ابھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے

اس فکری مرحلے سے گزرتے ہوئے نادر تراکیب کی مثالیں سرور ساجد نے پیش کی ہیں۔

اس سے ملنا جلنا یونہی خوشنما رہ پائے گا
اگلے وقتوں میں بھی کیا یہ سلسلہ رہ پائے گا

رفتہ رفتہ وہ بچھڑ جائے گا تو پھر اس کے بعد
دل کے اس کھنڈر میں کوئی دوسرا رہ پائے گا
سرد موسم میں کسی کا منتظر دھن میں مگن
جنگلوں میں مور تنہا ناچتا رہ پائے گا

محولہ اشعار میں مضمون باندھنے کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے۔ان اشعار میں سائل کی صدا مخفی ہے لیکن شعر کی اثر انگیزی کا شور نمایاں ہے۔

سرور ساجد کے یہاں دوست، دشمن، چہرہ، آئینہ، راستہ، پتھر، حریف، نقوش، دائرہ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ان الفاظ کی مدد سے نئے تلازمے گڑھنے میں انھیں اس لئے کامیابی ملی ہے کہ معاملات زندگی میں انسانی اور تہذیبی قدروں کی بحالی میں جو دشواریاں سدّ راہ ہیں ان پر شاعر کی نظر ہے۔ظاہر ہے کے بغیر عمیق مشاہدے کے ذیل اشعار معرض وجود میں نہیں آسکتے۔

اندھیرا ہی اندھیرا دور تک تھا
بچھڑ کے اس سے میں رویا بہت تھا
سکون چہرے پہ طوفان دل میں برپا ہے
ہمارا حال سمندر کی تہہ کے جیسا ہے
تجھے کھا جائے گی یہ بے پنا ہی
سمندر آمرے پیالے میں بھر جا
سراب وآب کے مابین میں کہیں گم ہوں
وہ نور نور بدن پیرہن بدلتا ہوا
تشنگی تکمیل کو پہنچے تو وحشت پھر کہاں
یا سمندر چھوڑ یا سودائے صحرا چھوڑ دے

سرور ساجد کے محولہ اشعار کے تیور میں زندگی کے صداقت آمیز رویے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ساتھ ہی زندگی کے عطا کردہ مصائب جھیلنے کیلئے صلۂ رحمی کی التجا کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خورشید طلب

نام	:	خورشید عالم خاں
قلمی نام	:	خورشید طلبؔ
تاریخ پیدائش	:	۲۵/اگست ۱۹۶۳ء
تعلیم	:	بی۔کام
وطن	:	اکبر پور، روہتاس (بہار)
پیشہ	:	سرکاری ملازمت
آغاز شاعری	:	۱۹۷۶ء
تصنیف	:	دعائیں جل رہی ہیں۔شعری مجموعہ (۲۰۰۷)
مستقل پتہ	:	جی۔ایم آفس، کارگلی، بیرمو (بکارو)

خورشید طلب

جدیدیت کا جب غلغلہ کچھ کم ہوا اور اس کے رجحان نے صالح جدیدیت کی راہ پکڑی تو اس پر مسافت طے کرنے والوں میں ایک نام تیزی سے ابھر کر سامنے آیا وہ اسم خاص خورشید طلب کا تھا۔ خورشید طلب کی شاعری میں شروع سے ہی ارضیت پسندی کا وصف نمایاں ہو کر سامنے آیا اور اسی کے نتیجے میں پر گوئی ان کی طبیعت کا ایک حصہ بن گئی۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ شروع میں جو ادبی لہر چلتی ہے اس کی اتباع میں اچھے خاصے تخلیقی جوہر سے آشنا شعراء گمرہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں بشیر بدر، ظفر اقبال جیسے شعراء کی مثالیں دینا کافی سمجھتا ہوں۔ اردو شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین بخوبی سمجھتے ہیں کہ بشیر بدر اور ظفر اقبال جس نوعیت کی شاعری کر چکے ہیں۔ ان کے رنگ میں کہنے والے شعراء پہلے بھی موجود تھے اور کم و بیش آج بھی ہیں۔ شعر و ادب میں اگر دور اندیشی اختیار نہ کی جائے اور ہر قدم پھونک پھونک کر نہ رکھا جائے تو شاعر کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بشیر بدر کی اکہری رومانی فنطاسی، ظفر اقبال، عادل منصوری کے استہزائیہ رنگ کب کے فنا ہو چکے ہیں لیکن بائی پروڈکٹ کی شکل میں ان کے مقلدین نے آج تک ان رویوں کو گلے لگا کر رکھا ہے۔ میں ان شعراء کا نام لینا دانستہ پسند نہیں کروں گا کیونکہ یہاں کسی بھی شخص کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ ان سطور کو لکھنے کی غرض و غایت محض یہ ہے کہ خورشید طلب شعوری لاشعوری دونوں سطح پر ان مکروہات سے بچتے رہے جو تقلیدی روش کے شاعر کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ شعور اور لاشعور کی بات آئی تو اس ضمن میں کہتا چلوں کہ خورشید طلب نے منزل کے حصول کیلئے دونوں طرح کے زینے کا استعمال ہنر مندی کے ساتھ کیا ہے۔ شعور کے مختلف معانی ہیں ہر وہ شعری عمل جو ترجیحات کے زمرے میں آتا ہے شعور کی کیفیت کی تشکیل کا روشن اشاریہ بن جاتا ہے اسطرح کی صواب دید جب حاصل ہو جاتی ہے تو شاعر ادراک و عرفان کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ خورشید طلب نے بجا طور پر زمان و مکان کے بیچ رشتگی، بے رشتگی پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ اس تنقید میں زندگی کی تضحیک بھی ہوئی ہے اور تعریف بھی۔ دونوں طرح کے عوامل کو برتنے کے لئے جس بالغ نظری کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے وہ خورشید طلب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

خورشید طلب کے یہاں شعر کہنے کا ایک جواز ہے۔اکثر یہ پہلے مصرعے میں چونکاتے ہیں۔غزل کا عام قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ پوری بات تو کہی جا چکی ہے لیکن خورشید طلب دوسرے مصرعے کی نزاکت کے واجبات کی نفی نہیں کرنے کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔اس طرح شعر منفرد اور وسیع معنوی نظام کا حاصل ہو جاتا ہے۔

شعر گوئی ایک مشکل اور سہل فن ہے۔مشکل اس لئے کہ اسکے لئے اوزان و بحور کی اوسط علمیت ضروری ہے سہل اس لئے کہ جسکی بھی طبیعت موزوں ہو وہ ہر چھ مہینے پر نیا مجموعہ کلام پیش کر سکتا ہے۔آجکل تو شعری مجموعہ پہلے اور شاعر بعد میں تولّد ہونے لگے ہیں لیکن جن لوگوں نے کسب فن کیا ہے، مطالعہ و مشاہدے میں قیمتی وقت صرف کیا ہے وہ اس زمرے میں نہیں آتے۔خورشید طلب موزوں طبع شاعر ہیں۔اوزان و بحور پر بھی نگاہ ہے۔شعر میں نیا مضمون باندھنے کی استطاعت ہے اس کے علاوہ جو سب سے بڑا ہنر ہے وہ یہ کہ پرگوئی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔مثال کے طور پر اس ضمن میں ان کے اشعار کے متعدد اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

زندہ ہیں اب ہواؤں کے رحم وکرم پہ ہم
وہ ڈور کٹ چکی ہے جو خیمے کی جان تھی

ہمارے بیچ تو کوئی حسین ہے ہی نہیں
ہمارے خیمے ہیں کیوں نصب کربلا کے قریب

بہت تکلیف دیتی ہے محبت
تمھاری رخصتی کے بعد جانا

وقت کی پیٹھ پر سوار
اور سوچو کہ کیا ضروری ہے

خوش ہوں کہ آج سے تری محتاجگی گئی
کیوں غم منا رہا ہے سہارے کی موت پر

تو اگر پتھر ہے اس بنیاد کا
حیثیت مثل ستوں رکھتے ہیں ہم

خورشید کے یہاں جدید اور جدید تر انسان کی بے قراریاں، محرومیاں صرف مضمون کی خانہ پری کے لئے استعمال میں نہیں آتی ہیں۔ نئی غزل میں خصوصاً عہد صارفیت کے دور میں انسان کا استعمال مشینی طرز اظہار میں ڈھل کر ایک نا قابل بیان استحصال کے لئے ہو رہا ہے۔ عہد کے شعور اور طرز اظہار میں اگر ہم آہنگی نہ ہو تو شاعر اپنی بات کہہ کر بھی داد طلب نگاہ سے ہماری طرف دیکھ رہا ہوتا ہے۔ خورشید طلب نے اس باب میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ نہ صرف مثبت ہے بلکہ انفرادی نوعیت کا حاصل بھی ہے۔ خورشید طلب نے اسی پس منظر میں شعر کہہ کر صاف کر دیا ہے۔

شعر میں عہد کے شعور کو دیکھ
طرز اظہار کی طرف مت جا
فاصلہ اور بھی بڑھ جاتا ہے گھٹنے کے بجائے
دور تک کوئی ملاقات کہاں تک جاتی ہے

انسانی سائیکی میں قربت اور دوری ایک ہی نوعیت کی چیز ہے۔ سائنسی نظریہ بھی ہے کہ Attachment کے بعد Detachment کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ خورشید نے دونوں طرح کی سوچ کو اپنی فکر میں جگہ دی ہے اور کامیابی سے گزرے ہیں۔ مزید یہ بھی کہ آج کے عہد کے انسان کے رشتوں میں عہد آفریں اور غالب رجحان کے پیش نظر خلاف توقع بُعد کی نئی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ خورشید نے "دور تک کوئی ملاقات کہاں جاتی ہے" کہہ کر اسی رویے کو ظاہر کرتے نظر آتے ہیں۔ خورشید نے یہاں "ملاقات" کا استعمال تعلق۔ ربط رشتے کیلئے کیا ہے جو محاورے کے طور پر اگر ہم اسکی نثر پر دھیان دیں تو خلاف قاعدہ ہوگا۔ لیکن اس ایک لفظ ملاقات کی معنوی ہمہ گیریت پر اگر ہم دھیان دیں تو جملۂ معترضہ مزید بامعنی ہو کر ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔ خورشید کے منتخب اشعار میں یہ شعر

وہی چمن وہی گریہ وہی بے نوری
تلاش آج بھی نرگس کو دیدہ ور کی ہے

قابل توجہ ہے۔ اقبال کا شعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سے متاثر ہوکر انھوں نے شعر کہا ہے اس سے شاید ہی خالق شعر کو انکار ہو، لیکن جیسا کہ اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ بعض اشعار کی تخلیق کی وجہ سے خود شاعر بھی آشنا نہیں ہوتا اور غیر ارادی طور پر یا تو وہ معکوس نظریے کی تبلیغ کرتا ہے یا پھر وہ الگ قسم کے Shades پیدا کر لیتا ہے۔ یہ شاعر کے ظرف خاص پر منحصر کرتا ہے کہ اس کی فکر کے پرندے کی اڑان ناموافق موسم کی زد پر ہے یا نیا گوشۂ عافیت تلاش کر چکی ہے۔ خورشید طلب کی خاکساری کہیئے یا طبیعت میں ابھرتی موج خیال کی ایک چھوٹی سی لہر جو اپنے وجود کی شناخت چاہتی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میر، غالب اور اقبال کی زمین میں ہم شعر تو بہ آسانی کہہ سکتے ہیں لیکن ان جیسی جذباتیت سے مملو کیفیات ہم نہیں پیش کر سکے۔ جو ان کے عہد کی طرف سے انھیں عطا کی ہوئی تھیں۔ خورشید نے جس ڈھنگ سے شعر کہا ہے وہ منہ چڑانے کا عمل نہیں ہے بلکہ اس سے ملتے جلتے شعر میں منضبط رویہ اپنایا ہے۔ ''وہی چمن وہی گریہ وہی بے نوری'' کی ترکیب سے شعری فضا تخلیق کرتے وقت بیانیہ انداز ایک طرف جہاں مرکز توجہ بنتا ہے تو دوسری طرف سماجی مطالعے کے پیش نظر نرگس کو تا دم تحریر ''دیدہ ور کی تلاش'' کا اظہار معنوی افق کو بدل دیتا ہے۔ خورشید کی اس تشویش میں وطن عزیز اور اپنی قوم کے مستقبل کی عدم تحفظ کا درد سمٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسطرح خورشید طلب نے اقبال کے رنگ میں شعر نہ کہہ کر اپنے رنگ طبیعت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جگنو کے حوالے سے تخلیقی شعراء نے اکثر انفرادی نوعیت کے مضامین غزل میں باندھ کر اپنی غزل گوئی کی سمت روشن کی ہے خورشید نے بھی ''جگنو'' کو اپنے شعر کا مرکز بنایا ہے اور خوب بنایا ہے

میں ایک جگنو مری حیثیت ہی کیا لیکن
یہ کم نہیں خس و خاشاک مجھ سے روشن ہے

جگنو سے آگ لگنے کی ترکیب کا مظاہرہ مبالغہ آمیزی کی حد کو چھو کر شاعر کے پاس تہی دست لوٹ جاتا ہے لیکن یہ بات مشاہدے کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ جگنو کے جلنے بجھنے کے عمل میں بھی قدرت کی کاریگری موجود ہے۔ جہاں جگنو روشن ہوتا ہے وہاں کے خس و خاشاک روشن ہو کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ جگنو کی لمحاتی روشنی کی بھی اپنی قدر و قیمت ہے۔

نئی غزل کے عبوری دور میں مذہب بیزاری عام تھی۔ محمد علوی نے جب یہ کہا تھا کہ

مسجد شہید ہونے کا غم تو کیا مگر
دو چار دن بھی اس میں عبادت نہ کر سکا

تو شعر وادب میں کافی واویلا مچا تھا۔ مغربی دانشوروں نے اپنی تھیوری میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی خدا کی موت ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ وجودیت /عدم وجودیت کے حوالے سے کہا گیا تھا لیکن خورشید طلب نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کافی وثوق کے ساتھ بانگ دہل شعر میں کہہ دیا ہے

کسی دن دیکھ لینا مسجدوں سے
خدا کی موت کا اعلان ہوگا

اور پھر یہ بھی کہا کہ

بزرگوں کی دعائیں ساتھ رکھ لے
ترا ہر راستہ آسان ہو گا

بظاہر اول الذکر شعر سے خدا کی موت کے اعلان اور موخر الذکر شعر سے بزرگوں کے لب سے نکلی دعاؤں کی اہمیت کا اظہار ہوا ہے۔ پہلے شعر میں کلیدی بات ہے مسجدوں سے خدا کی موت کا اعلان ہونا میرا خیال ہے روئے زمین کا ہر خطہ عبادت گاہ بننے کا مستحق ہے اور جب تک ہمیں اپنے بزرگ و برتر میسر ہیں ان کی دعاؤں سے ہر پرخطر راستے آسان ہو سکتے ہیں۔ شاعر کو عبادت گزار بندوں کی دعاؤں پر اعتماد ہے لیکن حالات حاضرہ کے مذہبی ٹھیکیداروں کی مذہب اور خدا کے تئیں جو بیزاری دیکھنے کو مل رہی ہے اس سے قطعی انھیں اتفاق نہیں ہے اور شاید اسی لئے انھوں نے کہا کہ ایک دن ایسا نہ ہو کہ یہ خدا کی موت کا اعلان کر دیں۔ خورشید طلب کا پہلا شعری مجموعہ ''دعائیں جل رہی ہیں'' منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے لہجے کی برجستگی، شائستگی اور ان کی فکری جہت انہیں شعری دنیا میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہیں۔

تھکن کی دھوپ میں جب سامنا شجر سے ہوا
مجھے لگا میں بغل گیر اپنے گھر سے ہوا
اک انتشار میں ہر شخص جی رہا ہے مگر
کسی سے پوچھوں تو کہتا ہے بات کچھ بھی نہیں
کہاں تک دیکھتے پیچھے پلٹ کر اپنے گھر کو ہم
ہمارے واسطے ہر گام پر بن واس رکھا تھا

شمس فریدی

نام	:	شیخ عبدالعزیز
قلمی نام	:	شمس فریدی
والد	:	عبدالغفور
ولادت	:	۱۹۳۸ء
تعلیم	:	گریجوئیٹ
ملازمت	:	ٹسکو (ریٹائرڈ)
تصنیف	:	بے کنار (زیر ترتیب)
پتہ	:	دین محمد ہاؤس، گوری شنکر روڈ، جگسلائی، جمشید پور

شمس فریدی

شمسؔ فریدی کا شمار جھار کھنڈ کے نامور شعراء میں ہوتا ہے ان کی پہلی شعری کتاب "بے کنار" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ "بے کنار" میں شامل کلام کی معنویت کے ذائقے سے ادبی حلقہ پہلے سے آشنا ہے۔ ملک کے اہم رسائل و جرائد میں ان کا کلام مسلسل طور پر شائع ہوتا رہتا ہے۔ شمسؔ فریدی کے تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ مطالعے کی وسعت اردو شعری روایت پر گہری نظر اور عصری حسیّت کی کارفرمائی نے ان کے ذہن و دل کو زرخیز کیا ہے۔ جمشید پور کے جن چند ناموں نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے ان میں ایک نام شمسؔ فریدی کا بھی ہے غزل اور دوہے میں ان کا مخصوص رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ شمسؔ فریدی کے یہاں شعری ٹریٹمنٹ کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ ان کی غزل کے ہر شعر میں کوئی ایسا کلیدی لفظ ہوتا ہے جو شعر کی عمارت سازی میں کلیدی اور محرّک کا رول انجام دیتا ہے۔ شمسؔ فریدی کا دکھی من میر کے حزنیہ رنگ سے مماثل نظر آتا ہے۔

رو رو میں نے رات گزاری اس بستی میں یار
کاش کسی نے پوچھا ہوگا حال مرا اک بار
گونگے بہرے لوگ جہاں ہوں کالی ہو جب رات
سننے والا کون یہاں ہے میرے دل کی بات

محولہ اشعار دوہے کے ہیں حالانکہ اس دوہے کی بحر پر اہل علم کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان اشعار کی معنوی وسعت سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹی بحروں میں ان کے کلام کی پختگی کے نمونے غیر محسوس طریقے سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار اسی زمرے میں آتے ہیں۔

خار زارِ حیات سے گذرے
گویا ہم پلِ صراط سے گزرے
تجھکو پانے کی چاہ میں یارب
ہم حدِ کائنات سے گزرے
سب کو ہے دعوئ ہمہ دانی
کون عرفانِ ذات سے گزرے

انوری بیگم

نام	:	انوری بیگم
قلمی نام	:	انوری بیگم
والد	:	زین العابدین
تعلیم	:	ایم۔اے،ڈی لٹ،بی ایڈ
شغل	:	درس وتدریس
تاریخ ولادت	:	۱۵/مارچ ۱۹۵۷ء
جائے ولادت	:	جمشید پور
آغاز شاعری	:	۲۰۰۰ء
تصانیف	:	(۱) قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر ۲۰۰۱
		(۲) کرچیاں اعتماد کی ۲۰۰۱
		(۳) خاموش شکوے (شعری مجموعہ) ۲۰۰۲
		(۴) طائر خوں فشاں ۲۰۰۳
		(۵) درد آشنا ۲۰۰۵
		(۶) شائق مظفر پوری فکر وفن ۲۰۰۶
		(۷) آئینہ ۲۰۰۷
پتہ	:	ہولڈنگ نمبر ۸،روڈ نمبر ۱۵/محلہ ذاکر نگر،آزاد نگر، جمشید پور۔۸۳۲۱۱۰

انوری بیگم

انوری بیگم شاعرہ کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت رکھتی ہیں۔ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔"طائر خوں فشاں" اور" درد آشنا" دو شعری مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہو کر ادب کے سنجیدہ حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ان کی تخلیقات پر ملک کے نامور ناقدین نے مضامین لکھے ہیں۔انوری بیگم کی ادب کے تئیں پر خلوص ڈھنگ سے سپردگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ محترمہ اردو زبان کی سچی خدمت گزار شاعرہ ہیں۔شعر وادب کے انعکاس کے لئے دو ہی پلیٹ فارم ہیں۔ رسائل و جرائد یا پھر مشاعرہ گاہ۔اول الذکر جگہ پر شاعرات کا معیاری کلام کا چھپنا دلچسپ تجربے سے گزرنے کا عمل ہے۔پرچے کا مدیر اگر بالغ نظر ہے تو کافی چھان پھٹک کے بعد تخلیق کے شائع ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔شب خون،تحریک، کتاب، شعر و حکمت،سوغات،شاعر میں شائع ہونے کے لئے کافی دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا تھا۔اوّل تو ان پرچوں میں تخلیقات بھیجنے کے پہلے ان کے معیار کو مدّنظر رکھا جاتا تھا پھر مدیران سے کافی خط و کتابت کے بعد بہ لحاظ معیار تخلیقِ اشاعت کے لئے منتخب ہوتی تھی۔انوری بیگم کی تخلیقات کیلئے محولہ جرائد کے دروازے اس لئے بند ہو گئے یا پھر مناسب کہیں تو شاعر کو چھوڑ کر مقفّل ہو گئے کہ یہ حیات نہیں ہیں ورنہ انوری بیگم کی تخلیقات ان کے صفحات کی زینت ضرور بنتیں۔آج کے عہد میں جن پرچوں کی دھوم ہے ان میں انوری بیگم کی تخلیقات تواتر سے شائع ہو کر مقبول ہو رہی ہیں۔اب مشاعرے کی طرف آتا ہوں۔مشاعرے میں جسطرح کی چیزیں پڑھی جاتی ہیں اس لحاظ سے انوری بیگم کا کلام کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔مشاعرے کی اہمیت و آفادیت پر مختلف گروپ اپنی آرا کو مستحسن سمجھتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کامیاب مشاعرہ کے اہتمام کیلئے شعراء کے سنجیدہ کلام کو کم اور مترنم شاعرات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔انوری بیگم اسٹیج کی شاعرہ نہیں ہیں یہ رسائل و جرائد کی شاعرہ ہیں۔آج ہندوستان میں جتنے بھی رسائل ہیں ان کے کلام کو تزک و احتشام سے شائع کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انوری بیگم کے کلام کا لہجہ ان شاعرات کی طرح نہیں ہے جو تانیثی اظہار فکر کے تابع رہ کر محبوب یا پھر شوہر کی ہر تلخ و ترش ادا کو شعری پیکر عطا کر سمجھ لیتی ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا جاسکتا حالانکہ اسطرح کی خام رومانیت پر تصنّع کا

اتنا دبیز غلاف پڑا رہتا ہے کہ نو دریافت شاعرات سمجھ ہی نہیں پاتیں۔ اس ضمن میں پروین شاکر، رفیعہ شبنم عابدی، حسنیٰ سرور کے حوالے دے کر لوگوں کو مطمئن کرتی ہیں کہ نسائی لہجہ یہی ہے۔ انوری بیگم نے اس سر درِ روایت کو توڑنے کی شعوری کوشش بھی کی ہے اور لاشعوری طور پر بھی اپنے شعری وجدان کو خارجی اثرات سے براہ راست متاثر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس ضمن میں ''طائرِ خوں فشاں'' سے اور 'دردِ آشنا' سے متعدد اشعار نقل کئے جا سکتے ہیں جو انوری بیگم کی ذہنی کیفیات کا احاطہ کرتے ہیں۔

مسائل سے نہیں فرصت کسی کو
یہی تو انوریؔ دیکھا گیا ہے
ہوا نے ہم سے دستارِ فضیلت چھین لی لیکن
نشہ ہے آج بھی سر میں سمایا کج کلاہی کا
رشک کرنا چاہئے تھا دیکھ کر اس کا عروج
کیوں حسد کرتے ہو اس کی کامرانی دیکھ کر
گلہ بربادیوں کا انوریؔ کس سے کرے آخر
یہ لمحوں کی عنایت ہے کہوں تو کیا کہوں تم سے
مجھے وہ مل گیا چاہت تھی جسکی
زمانہ اب مجھے چاہے مٹا دے

درج بالا اشعار 'طائرِ خوں فشاں' سے ماخوذ ہیں۔ ان اشعار کے مطالعے سے اس نکتے پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ انوری بیگم کا شعری سفر خارج سے داخل کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ اشیائے کائنات سے یہ بشر براہ راست طور پر متعلق ہے۔ معاملاتِ زندگی میں خرد و کلاں سبھی کی اپنی اہمیت ہے یہ شاعر یا شاعرہ کے شعری ٹریٹمنٹ پر منحصر کرتا ہے۔ وہ اسے کس طرح پیش کرتا ہے۔ انوری بیگم کو زندگی سے کئی شکایتیں ہیں۔ یہ شکایتی لہجہ ٹھوس عقلی حقائق کے مشاہدے کے بعد جو روپ اختیار کرتا ہے وہ پسندیدہ ہی نہیں بلکہ قابل قبول ہے کیونکہ اس میں پامال اقدار کے تحفظ کے لئے کوششیں ثمر آور ہیں۔ انوری بیگم نے اسی لئے برملا طور پر کہا ہے۔

رشتۂ درد معتبر نکلا
دل سے اب ہر طرح کا ڈر نکلا
بحرِ ہستی سے ہم بھی یوں نکلیں
سیپ سے جس طرح گہر نکلا
بن گئی یہ زمین پتھرّ کی
اور نالہ بھی بے اثر نکلا

محولہ اشعار میں کئی ایسے استعارے پیش کیے گئے ہیں جس سے تخلیقی چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً رشتۂ درد، بحرِ ہستی، زمین کا پتھر ہونا، نئے شعری تراکیب کے ساتھ باندھے گئے ہیں۔ درد آشنا کو انوری بیگم کے شعری سفر کا ارتقائی پڑاؤ کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اس مجموعے کی شاعری کے حوالے سے بات کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انوری بیگم کی غزلوں میں سماجی بصیرت کا انعکاس کس حد تک ہوا ہے۔ مزید یہ کہ ان کے اپنے ذاتی دکھ اور کرب کو سمیٹنے میں کتنا کامیاب ہوئی ہیں۔
اردو شعر وادب کے بلند مرتبہ ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس مجموعے میں شامل تخلیقات کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے من وعن اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بقول وہاب اشرفی انوری بیگم کا یہ نیا مجموعہ چند نئے احساسات سے بہرہ آور نظر آتا ہے کچھ شعر تو ایسے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ انوری کے یہاں چھپنے چھپانے کا عمل تیز ہے لیکن اب وہ ردو انتخاب کے مرحلے سے بھی گزر رہی ہیں اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔
رونق شہری نے بھی اس کتاب میں انوری بیگم کی شاعری کے متعلق تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انوری بیگم نے کچن روم، ڈائننگ ٹیبل، لان اور فلک بوس عمارتوں میں دم توڑتی تہذیب کی نوحہ گر ہونے سے جہاں خود کو بچائے رکھا ہے وہیں دوسری طرف خارجی عوامل سے برآمد مجروح کن صورت حال کی سچی تصور کشی کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔
افتخار امام صدیقی مدیر شاعر نے انوری بیگم کی شاعری سے متعلق بجاطور پر اعتراف کیا ہے کہ یہ ایک حساس سوچوں کی شاعرہ ہیں۔ انھوں نے 'خاموش شکوے' سے 'درد آشنا' تک کی غزلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ انوری بیگم اردو کے نسائی ادب میں نووارد ہیں تاہم انھوں نے

شاعری کے ذریعہ قاری سامع اور ناقد کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے اس میں انھیں زیادہ وقت نہیں لگا اور تبدریج آگے ہی سفر کررہی ہیں محولہ تناظرات کی روشنی میں اگر ہم انوری بیگم کے ذہنی ارتقا کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے کلام میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی ہے۔

وہ یوں ملا کہ مجھے درد آشنا ہی لگا
اسے جو دل میں بسایا تو اک سزا ہی لگا
ستم ظریفیٔ قسمت ہے کیا کہا جائے
مفاد اس کا مری ذات میں چھپا ہی لگا
انوری خود کو جانتی میں بھی
ایسا لمحہ کوئی ملا ہوتا
تجھکو پہچان کر خود سے ہوں اجنبی
مجھکو تیرے سوا جانتا کون ہے
اگر ہم بے ارادہ چل رہے ہیں
ہماری راہ میں دیوار کیوں ہے

محبوب اکیلا

نام	:	محبوب الدین
قلمی نام	:	محبوب اکیلا
تاریخ پیدائش	:	۱۵؍جولائی ۱۹۳۹ء
جائے پیدائش	:	بشن پور، پچمبا۔ گریڈیہہ
تعلیم	:	بی۔ اے۔ ڈپ ان ایڈ
ملازمت	:	درس وتدریس (ریٹائرڈ)
شغل	:	شعروشاعری
تصانیف	:	کوچے کی صدا۔ شعری مجموعہ
	:	تنکے " " (اردو رہندی)
پتہ	:	بشن پور، پچمبہ، گریڈیہہ

محبوب اکیلا

محبوب اکیلا گریڈیہہ کے ایسے شاعر ہیں جسکے کلام کی شہرت سارے ملک میں پھیل چکی ہے۔ گریڈیہہ سے ہی ہری کشور نظر تعلق رکھتے ہیں یہ اپنی نغمگی کی وجہ سے مشاعرے کی جان ہوا کرتے تھے لیکن محبوب اکیلا کی شخصیت ایسی ہے جنکے کلام کا رنگ دو آتشہ ہے یعنی گمبھیر نوعیت کی غزل اور پھر اسے ترنّم سے پڑھنے کے بعد ایک الگ ہی قسم کا سماں باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں مشاعرے میں بھی دو اقسام کے سامعین ہوا کرتے ہیں ایک وہ جو محض ترنم پر فدا ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو بھرپور تغزل اور غنائیت سے مملو اشعار پر سر دھنتے ہیں۔ آہ اور واہ کی تفریق مشاعرے میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اشعار کی المنا کی پرواہ کی جگہ آہ نکلنی چاہئے لیکن ہوتا بالکل اس کا برعکس ہے۔ محبوب اکیلا اپنے نام کے اعتبار سے شاعری میں تنہائی جیسے عام موضوع پر متواتر شعر کہتے نظر نہیں آتے لیکن صورت حال کی پیشکش میں اپنا حزنیہ رنگ جسطرح بکھیرتے ہیں اس سے ان کے یہاں عرض ہنر کے تخلیقی لباس پہن لینے کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کر رہا ہوں۔

جب بھی جائے گا اکیلے میں اکیلا چھوڑ کر
اشک آنکھوں میں مگر وہ رولتا رہ جائے گا

انا کی دھوپ سے خود کو بچا کے رکھئے گا
نہیں تو چھاؤں بھی ہوگی رقیب گاؤں میں

سمجھ لو کہ جب کوئی فتنہ اٹھا ہے
ہمارا قلم تب لہو تھوکتا ہے

یوں ہی دنیائے دل میں سوکھی ہوئی
آرزوؤں کی گھاس رہنے دے

اندھیرا اندھیرے میں ضم ہو رہا ہے
چراغوں سے پوچھو یہ کیسی فضا ہے

اندر سے ہم ایسے ٹوٹے
ٹوٹے جیسے برتن گھر میں

محبوب اکیلا کی شاعری میں گاؤں کا استعمال بار بار ہوا ہے۔ انھوں نے گاؤں کو اپنی ہی نگاہ سے دیکھا ہے۔ گاؤں والوں کی معصومیت اور وہاں کی آب وہوا کے تعلق سے متعدد اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ معاملات زندگی میں واقعات کی تلخی، سلوک ناروا کا احساس ان کی شاعری کو باندھے رہتا ہے۔ اسی تعلق کی نوعیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے درج ذیل اشعار کہے ہیں۔

کرتے ہو دل کا خون مرے یار تم مگر
لگتے نہیں ہو پھر گنہگار کی طرح

مشیت الٰہی پر انھیں یقین ہے اور ہر ظلم اور جبر کی انتہا کے خاتمے کا احساس بھی۔ اسی لئے ان کی نوک قلم سے اس نوع کے اشعار ملتے ہیں۔

جب اس کے ظلم وجور کی ہوتی ہے انتہا
ہوتا ہے ہر زمانے کا راون لہو لہو
ہم کرم کو ستم نہیں کہتے
ہاں خدا کی قسم نہیں کہتے

محولہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ محبوب اکیلا کی شعری کائنات میں موضوع کی رنگارنگی ہے اس لئے اپنے اظہار کیلئے انھیں زیادہ دور بھٹکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

حفیظ بیتاب

قلمی نام	:	حفیظ بیتاب
نام	:	محمد حفیظ خان
والد	:	محمد رئیس خان
تاریخ ولادت	:	۱۶/جنوری ۱۹۴۱ء
مقام ولادت	:	موضع بہیڑا، گورارو، ضلع گیا (بہار)
تعلیم	:	بی۔اے آنرز (انگلش)، ایم۔اے (اردو) بی ایڈ
پیشہ	:	سابق ٹیچر، آر ڈی ٹاٹا ہائی اسکول ٹاٹا اسٹیل (جمشید پور)
موجودہ مصروفیت	:	پرنسپل، سمبوسس پبلک اسکول، آزاد نگر، جمشید پور
تصنیف	:	قطرہ قطرہ لہو (پہلا شعری مجموعہ) ۔ ۲۰۰۵ء
پتہ	:	رئیس منزل ۔ ۶۹ سی ۔ ایس کالونی ۔ آزاد نگر، مانگو، جمشید پور

حفیظ بیتاب

حفیظ بیتاب کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندی کے عہد میں شعروادب سے رشتہ استوار کیا۔ اردو غزل کی حسین روایت کے گہرے مطالعے سے انھوں نے اردو غزل میں ایک ایسے لہجے کو اپنے غالب اظہار کا وسیلہ بنایا جہاں ترسیل کی ناکامی کے خدشات سر نہیں ابھار سکتے۔ حفیظ بیتاب زمان ومکاں میں ہوتی تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ زندگی کے تلخ وتند اثرات کو آنکھوں سے دل وجگر تک اتارا ہے عمیق مشاہدے سے جنون وخرد، خلوت وجلوت، اثبات ونفی کی کشا کش کو سمجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شاعر کا مطالعہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہو وہاں شاعری اپنے تمام منجملہ حسن کاری کے ساتھ موجود ملے گی۔

حسن کاری کے لئے شعروادب کی مقبول ترین صنف غزل کے ساتھ انھوں نے بے حد فنکارانہ سلوک کا مظاہرہ کیا ہے۔ حفیظ بیتاب کو زندگی پھولوں کی سیج نہیں نظر آتی، انھیں زندگی کرنے کی خو میں دشواریاں پیش آتی ہیں اسے جہاد زیست سے موسوم کرتے ہیں۔

غم حیات سے ناآشنا جو رہتا ہے
جہادِ زیست میں ہرگز وہ کامیاب نہیں

پروفیسر نادم بلخی نے بجا طور پر کہا ہے کہ اقبالؔ نے معجزۂ فن سے خون جگر کی نمود اور فیض نے خون دل میں انگلیاں ڈبونے کی بات کہی ہے۔ حفیظ بیتاب بھی ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔ مذکورہ شعر میں جہاد زیست کی اضافتی ترکیب سے بیتاب نے زندگی کے تئیں جن رویوں کو ظاہر کیا ہے وہ مثبت قدروں کی بحالی میں معاون نظر آتے ہیں۔ حفیظ بیتاب نے برملا طور پر سوال اٹھایا ہے اور پھر جواب بھی دیا ہے کہ میں شعر کیوں کہتا ہوں؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں ابھرتا ہے اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ تمام فنون لطیفہ کا جنم خودنمائی کی کوکھ سے ہوا ہے۔ ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ موجزن رہتا ہے اور اپنے اظہار کا وسیلہ ڈھونڈتا ہے۔ حفیظ بیتاب کی فن کے تئیں یہ تشریح مارکسی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہے۔ لیکن جیسا کہ خود شاعر نے کہا ہے میں شعر اس لئے کہتا ہوں کہ جو واقعات و کیفیات مجھے متاثر کرتے ہیں

چاہتا ہوں دوسرے بھی اس سے اثر قبول کریں۔ ظاہر ہے کہ حفیظ بیتاب کے چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں اچھی اور سچی شاعری لاشعور کی کارفرمائی ہے۔ واقعات وسانحات کے خارجی عوامل اور داخلی کیفیات جب متصادم ہوتے ہیں تو آپ بیتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ آپ جن سانحات سے گذرے ہیں ان المناک لمحوں میں شرکت کرنے والے عناصر کی پذیرائی ہی صلۂ شاعری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس زاویے سے حفیظ بیتاب کی شاعری مجھے مایوس نہیں کرتی ہے۔

سونے سونے سے میرے آنگن میں
برہنہ پیڑ اک ہے ایستادہ
خود تکلم بھی ہو فدا جس پر
ہے وہ بے تاب خامشی اپنی
تم کو کیا بتائیں کیا دل کا حال رہتا ہے
مجھ کو جب بلاتا ہے دوپہر کا سناّ ٹا
کچھ تو آوارگئی دل کا نشاں چھوڑ چلیں
وادئ شوق میں وحشت کا کوئی پھول اگا
مسکتی جارہی ہے شب کی چادر
کوئی سورج ابھر نا چاہتا ہے

حفیظ بیتابؔ کا شعری مجموعہ 'قطرہ قطرہ لہو' حال ہی میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے اس کتاب پر بر صغیر کے اہم ناقدین کے مثبت تبصرے شائع ہورہے ہیں۔ حفیظ بیتاب کی شاعری کی دوسری روشن جہت منفی استعارے سے مثبت شعریت کی فضابندی ہے۔ حفیظ بیتاب کے منفرد ہونے کیلئے یہ ذہنی رویہ اگر انھوں نے مستقل اپنی شاعری میں جاری رکھا تو قارئین غزل ان سے مزید بہتر توقعات قائم رکھ سکتے ہیں۔

بکھرنے میں بھی ہے اک حسن پنہاں
وہ ناداں کیوں سنور نا چاہتا ہے
جسکی تلاش کرتا رہا میں صدی صدی
اس سے ملا جو آج تو آئینہ ہو گیا
اسے بھی ہوگا بچھڑنے کا کچھ نہ کچھ صدمہ
اس گمان کی سچائیوں پہ جیتا ہوں
اس کو قریب پایا تو احساس یہ ہوا
جیسے خود اپنے آپ سے ہم دور ہو گئے
جب کسی نے نہ پوچھا تو پھر ایک دن
بے کسی میرے گھر کا پتہ لے گئی

محولہ اشعار حفیظ بیتاب کی شاعری کے فکری نظام کی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

احمد بدر

نام	:	سیّد بدر احمد
قلمی نام	:	احمد بدر
والد	:	سیّد سراج احمد مرحوم
تاریخ پیدائش	:	۹رفروری ۱۹۵۸ء
جائے پیدائش	:	محمد پور مبارک، مظفر پور
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو رفارسی)، پی، ایچ ڈی (جاری)
ملازمت	:	کریم سٹی کالج جمشید پور
آغاز شاعری	:	۱۹۷۶ء سے
پتہ	:	شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور

احمد بدر

احمد بدرؔ شہر آہن جمشید پور میں بودو باش اختیار کرتے ہیں۔اس شہر کی شناخت اسٹیل سٹی کی حیثیت سے ہے دوسری پہچان فسادات کی وجہ سے۔ یوں تو اس شہر میں لاتعداد شعراء ہیں ان میں بہت کم شعراء نے فساد اور اس کے بدصورت چہرے سے نقاب کشائی کی ہے۔ مشاعرے کی دنیا میں جوگا سنگھ انور اور اسلم بدر نے اس شہر کا تعارف موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ احمد بدر بھی اس مکروہ صورت حال کو جھیل چکے ہیں اس لئے ان کی شاعری میں جا بہ جا ایسے اشعار مل جاتے ہیں جس سے اس شاعر کی ذکی الحسی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یکبا رگی جو شہر کا منظر بدل گیا
کھڑکی سے جھا نکتا ہوا بچہ دہل گیا
کشید گی تھی چہار جانب
کشاد گی درمیان بھر تھی
بدامنی، انتشار، تعصب جفا، فریب
کیا کیا بے اعتباری کی شاخوں پہ پھل گیا

احمد بدرؔ کے محولہ اشعار اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ احمد بدرؔ موضوعات کو برتنے میں خاص سلیقگی کا اہتمام کرتے ہیں۔احمد بدر کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی دیکھنے کو ملتی ہے رسائل میں جو کلام نظر سے گزرتا ہے اس میں بھی کئی اشعار ایسے ہوتے ہیں جو شعری وجدان پر خوشگوار طریقے سے دستک دیتے ہیں۔ عہد جدید کا انسان ہر لمحہ تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال کی زد میں آکر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ یقین کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے گمان کا آغاز وہاں سے کیوں نہیں ہوتا ہے؟ دھوپ اور سائبان کے بیچ تمیز کیوں نہیں باقی رہ گئی ہے؟ ان سوالات کو جائز ٹھہرانے کا ہنر احمد بدر کے پاس پرُ جواز ڈھنگ سے موجود ہے۔

یقین جس پہ ہو کامل اسے گماں کہئے
کبھی تو دھوپ کی شدت کو سائباں کہئے

ایک غزل جسکی ردیف "تراش کر رکھ لے" ہے اس غزل میں فکروفن کے گل بوٹے احمد بدر نے بڑی مشاقی کے ساتھ کھلائے ہیں۔

اپنا پیکر تراش کر رکھ لے
خود سے بہتر تراش کر رکھ لے
اپنے قد کو تو اور اونچا کر
سر پہ اک سر تراش کر رکھ لے

ماضی کی وراثت، تہذیبی سرمایہ اور آج کی تہی دستی پر احمد بدر کی گہری نظر ہے

نہ دے سکا کہ یہی اس کی ساری پونجی تھی
وہ ایک لمحہ جو ماضی سے حال نے مانگا

احمد بدر غزل کی نئی نئی زمین تلاش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مضامین کی ندرت ہے۔ ادھورا مکان کو بے ترتیب کہنا پھر اس کے حوالے سے اپنی زمین و آسمان کو بے ترتیب کہنا کمالِ فن وشاعری ہے۔ بہ یک نگاہ کسی شئے کا اپنی جگہ پر سلیقے سے نہیں ہونا اور پھر سائبان اور دھوپ کا بے ترتیب ہونا، احمد بدر کی نگاہ توجہ میں خصوصی طور پر جگہ پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ احمد بدر کے یہاں مزاج میں شعری کیفیات کو لباسِ پیکریت عطا کرنے کی لاشعوری طور پر جو مساعی نظر آتی ہے وہ مستحسن ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے ایسے اشعار ہیں جو نئی غزل کے باذوق قارئین کی طبیعت کی ضیافت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار

عمر جب رائیگاں گزرتی ہے
روشنی بھی گراں گذرتی ہے
وہ تپش ہے کہ آج تتلی بھی
سائباں سائباں گذرتی ہے
عیب سارے چھپا کر اندر رکھ
حسن با ہر تراش کر رکھ لے
غموں کی حدّت جہان بھرتھی
خوشی ترے سائباں بھرتھی
زرد تو اڑ چلے ہواؤں میں
سبز پتوّں نے شاخ کیوں چھوڑی
آیا ہے جب سے چہرہ پسِ چہرہ دیکھنا
آتے نظر ہیں مجھکو کئی خوبروعجیب

جمیل مظہر

نام	:	محمد جمیل
قلمی نام	:	جمیل مظہر
والد	:	جمعراتی میاں
تاریخ پیدائش	:	۱؍ جنوری ۱۹۴۲ء
تعلیم	:	بی اے۔آنرز
ملازمت	:	ٹسکو (ریٹائرڈ)
آغازِ شاعری	:	۱۹۵۵ء
آبائی وطن	:	رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار
تصنیف	:	شعری مجموعہ زیرِ ترتیب
حال مقام	:	۶۴؍ چونا شاہ کالونی، آزاد نگر، مانگو جمشید پور۔۸۳۲۱۱۰

جمیل مظہر

جمیل مظہر جھارکھنڈ ریاست کے شہر آہن جمشید پور میں بود و باش رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالباً تیس (۳۰) برسوں تک شعری دنیا سے علیحدگی بنائے رکھا لیکن جب دوبارہ اس کائنات شاعری میں اپنا قدم رکھا تو شعری فلک پر دور دور تک چھا گئے۔ قلم میں اتنی روانی اور شاعری میں اتنی جولانی پیدا ہوگئی کہ جمشید پور کے ایک ادبی ادارے نے انھیں بسیار نویس کی سند سے سرفراز کیا۔

جمیل مظہر ایک کہنہ مشق اور ذکی الحس شاعر ہیں ان کی شاعری میں عمیق مشاہدے کی جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے بھی شہر جمشید پور کے المناک واقعات و سانحات کو اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھا اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کہاں وہ نور و نکہت ساز و نغمہ
ہمارے شہر میں ڈر بولتا ہے
لہو پیتا رہا وہ روز میرا
میرے خوں میں نشہ کچھ اور ہی تھا
قتل و خوں، لوٹ، فسادات اور عصمت ریزی
اور اس شہر کے اخبار میں رکھا کیا ہے
اِدھر ہونے نہیں دیتا اُدھر ہونے نہیں دیتا
کہیں بھی وہ ہمارا مستقر ہونے نہیں دیتا

محولہ اشعار میں دوران فساد کی تباہیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے وقتوں میں اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ رگِ جاں کے قریب رہنے والا بھی دشمنِ جانی ہو جاتا ہے اور اتنی بربریت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے آبادیاں ویرانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ راستے دشوار ہو جاتے ہیں۔ لوگ گھر سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ شاعر کا ایسے میں مضطرب ہونا بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔

اک ایک لمحہ قیامت سے کم نہ تھا یارو
بتاؤں کیا جو شب غم تھی کیفیت میری

جمیل مظہرؔ کی شاعری لفظیات کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں فکر کی گہرائی و گیرائی حد درجہ موجود ہے۔ شعر کہنے کے دوران انھوں نے جہاں بھی محتاط رویہ اپنایا ہے شعر کا کینوس وسیع و عریض ہو گیا ہے۔ ان کی شاعری میں عہد حاضر کی صداقت، عزیز و اقارب کی عنایت و رفاقت، سماجی اور معاشرتی چپقلش، زمانے کی کراہیت، زندگی کے نشیب و فراز، پامال ہوتی آدمیت، غم کی دھوپ میں پگھلتی انسانی زندگی و دیگر موضوعات کے علاوہ ان کا اپنا ذاتی کرب بھی نمایاں ہے۔ چند اشعار اس حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔

فکر نہیں ہے جسکو میری
مجھکو اسی کا دھیان بہت ہے

محفل میں کیا ہاتھا پائی
لڑنے کو میدان بہت ہے

بانٹ کر اپنا سرمایۂ زندگی
میں نے دکھلائی دریادلی بھول کی

اس فریبی کی باتوں میں پھر آگیا
پھر یقیں کر لیا پھر وہی بھول کی

ایک موہوم سی امید رفاقت اس سے
ورنہ اس محفل اغیار میں رکھا کیا ہے

پشت پر چھپ چھپ کے وہ کرتے رہے نشتر زنی
چارہ جوئی بھی مگر وہ روبرو کرتے رہے

سفر طویل ہے شدّت کی دھوپ بھی سر پہ
کسی درخت کے سائے میں لے لوں دم پہلے

ہم ہاتھ ان سے ملائیں گے بڑھ کے خود مظہر
مگر بڑھائیں تو وہ بھی ذرا قدم پہلے

جمیل مظہر کی شاعری تصنع سے پاک ہے انھوں نے خدا کی وحدانیت اور عنایات کا ذکر بیشتر شعروں میں کیا ہے جو ان کی خدا کے تئیں رغبت اور قربت کو ظاہر کرتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

سر زمانے کے آگے جھکا نا پڑا
چھوڑ دی جو تری بندگی بھول کی

میں ترے رحم و کرم پر ہوں پشیماں یارب
ورنہ مجھ جیسے گنہگار میں رکھا کیا ہے

جمیل مظہر کی شاعری میں قاری جہاں چبھتے ہوئے مسائل سے دوچار ہوتا ہے وہیں شعری جمالیات سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

تیری یادوں کو دیا میں نے غزل کا پیکر
اور مظہؔر مرے اشعار میں رکھا کیا ہے

بہت دل چاہتا ہے بھول جاؤں اس ستمگر کو
مگر خود سے وہ مجھکو بے خبر ہونے نہیں دیتا

کسی کو کچھ نہیں کہتا زباں سے
مگر آنکھوں سے اکثر بولتا ہے

وہ حسن و عشق کے قصے تھے جھوٹے
مگر اس میں مزا کچھ اور ہی تھا

اک نظر ہم دیکھنے کی آرزو کرتے رہے
وہ پس پردا ہی ہم سے گفتگو کرتے رہے

جمل مظہرؔ جہاں جہاں سنجیدہ ہوئے شعری پیکر کے اظہار میں نیا پن آیا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار کے مطالعہ سے ان کی عصری حسیت کا پتہ چلتا ہے۔

نہ جانے کیوں قلندر بولتا ہے
گھر کو بھی وہ پتھر بولتا ہے

نہیں رہتا کوئی اب اس مکاں میں
حویلی کا کبوتر بولتا ہے

فقط وہ ڈھونڈ رہا تھا خرابیاں مجھ میں
سمجھ لیا تھا جسے میں نے دیدہ ور اچھا

بچ کے چلئے گا آپ بھی مظہرؔ
حادثے رہگزر میں رہتے ہیں

معین الدین شمسیؔ

نام	:	محمد معین الدین
قلمی نام	:	معین الدین شمسیؔ
تاریخ ولادت	:	۲۵ر جنوری ۱۹۶۲ء
جائے ولادت	:	منجھلاڈیہہ، ڈاکخانہ، گانڈے، گریڈیہہ
تعلیم	:	ایم۔اے (فارسی، اردو)
ملازمت	:	درس وتدریس
آغاز شاعری	:	۱۹۸۹ء سے
شعری مجموعہ	:	نقشِ اوّل (زیر ترتیب)
پتہ	:	منجھلاڈیہہ، ڈاکخانہ، گانڈے، گریڈیہہ

معین الدین شمسی

معین الدین شمسیؔ نئی نسلوں کا ایک معتبر نام ہے جن کا تعلق شہر گریڈیہہ سے ہے ان کی شاعری میں روایت کا احترام بھی ہے اور جدیدیت کا استحکام بھی۔ ان کی شاعری کا ایک اہم وصف صاف گوئی اور سادگی ہے انھوں نے ابہام واہمال سے اپنی کائناتِ فکر ونظر کو بالا و پاک رکھا ہے ان کی شاعری گرد وپیش میں رونما ہونے والے سانحات وواقعات کا برملا اظہار ہے

دفعتاً جلنے لگے ہیں پھر غریبوں کے مکاں

بم، دھماکہ، گولیاں چاروں طرف ہیں آجکل

محولہ شعر میں حالات حاضرہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ ماحول کی کشیدگی سے لرزہ براندام ہونے والے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چہار جانب بموں گولیوں کی گھن گرج سے فلکِ ذہن پراگندہ ہو جاتا ہے۔ غریبوں اور مفلسوں کے حالات تو اور قابلِ ترحم ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کا پہیہ ان کی روزانہ کی کمائی پر ہی گردش کرتا ہے۔ شاعر اپنے سینے میں دھڑکنے والا دل رکھتا ہے۔ وہ سماج کی دکھتی رگوں پر دستِ شفقت رکھ کر اس کے غموں کو بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا دل ہر خلافِ توقع امر پر چیخ اٹھتا ہے۔

ان جوانوں سے پوچھو بنام جہیز

قوم کی بیٹیوں کو جلاتے ہو کیوں

جہیز آج ہمارے معاشرے کیلئے لعنت بنتا جا رہا ہے۔ بیٹیاں اللہ کی نعمت ہیں لیکن اس جہیز کی لعنت نے ان کی قدر واہمیت کو پامال کر دیا ہے۔ شاعر نے اس شعر کے حوالے سے عصر حاضر کے نوجوانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے شاعر کو ماں کی عظمت ومرتبے کا بھی خاصہ خیال ہے جس کا اظہار وہ اپنے اشعار میں اسطرح کرتے ہیں۔

ماں کی عظمت جس کے سینے میں نہیں
عمر بھر سجدہ کرے بے کار ہے
خوفِ عقبیٰ کا بھائی ذرا کیجئے
ماں کے قدموں تلے ہی رہا کیجئے

شمسی کو مشاہدہ و مطالعہ سے شعری فلک کا جہانِ معنی پیدا کرنے کا ہُنر آتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار عصری حسیت کے تقاضے کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

نکتہ چینوں کے مقابل رکھ دو شمسی آئینہ
کون ہے بے داغ چہرہ فیصلہ ہو جائے گا
وہ پیاسا ہے تو پی سکتا ہے کتنا
سمندر پاس لا کے دیکھتے ہیں
نگاہِ خاص سے دیکھا کرے وہ
دعا کو ہاتھ اٹھا کے دیکھتے ہیں
اپنا اپنا ظرف اور کردار ہے
میری گردن آپ کی تلوار ہے

میں اور میری شاعری

ماہرلسانیات نے زبان کے تین اقسام بتائے ہیں تکلمی تحریری اوراشارتی۔ یہ واحد متکلم پر منحصر ہے کہ کون سی قسم اسے حیوانِ ناطق کے زمرے میں لاتی ہے۔ زبان بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ان کے اظہار سے قوموں کے تہذیبی ارتقا کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حرف ولفظ کی تشکیل اور ایجاد سے پہلے بھی خیالات کی ترسیل ہوتی رہی ہے۔ صوت وصدا نے لباس معنی پہننے کے مدارج طے کرتے ہوئے جب میرے تخلیقی شعور کو بیدار کیا تو اضاف سخن کی مقبول ترین صنف غزل کے ساتھ ذہنی رشتہ استوار کرنے میں آسانی ہوئی۔ مجھے شروع سے ہی کلام پاک کی قراءت خاص اپنی طرف راغب کرتی رہی ہے۔ اس الہامی کتاب میں سورۂ رحمٰن کی تکرارِ لفظی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی روح پرور صوتی نغمگی سے مجھے شعر کہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایسا بھی نہیں کہ میں محض لذّت آواز میں گرفتار ہوکر غزلیہ شاعری کے دیگر محاسن چشم پوشی کئے بیٹھا رہا۔ اپنے پیش روؤں کے عطا کردہ شعری سرمایے سے ذہنی بصیرت حاصل کرتے ہوئے مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لائق میں کہاں ٹھہرتا ہوں کہ ابھی مجھے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کے مصداق ارتقاء کی منزلیں طے کرنی ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ دینی تعلیم کے ساتھ دیناوی تعلیم بھی ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مکتب سے یونیورسٹی سطح تک کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مجھے ملے ہیں۔ مذکورہ دونوں طرح کی تعلیمات کی حصولیابی کی وجہ سے دنیا کو حسین اور مکروہ کہنے کے علاوہ بھی میرے پاس اس کے کئی مترادفات موجود ہیں۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار براہ راست میری شاعری میں ہوا ہے۔ میں روایت اور ترقی پسندی پر استہزائیہ انداز میں پھبتی کسنے کی بھول نہیں کرسکتا۔ شعروادب میں قدروں کے استحکام کا معاملہ گزشتہ سے پیوستہ کا ہے۔ نئی غزل میں بھی وہی شاعری زندہ رہ سکے گی جن کی جڑیں حسین روایات سے جڑی ہیں۔ میں روایت کا پاسدار بھی ہوں اور عصری حسیّت کا مبلغ بھی۔ زندگی سے براہ راست مکالمہ کرنے کا دم

خم رکھنے والے شعراء کی آخری قطار میں بھی جگہ مل سکی تو سمجھوں گا میری بصارت اور بصیرت دونوں ہی کارآمد ہیں مجھے اپنی رایئگانی کا خوف ہمیشہ ستا تا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے خدشات کا اظہار میری غزلوں میں جابہ جا دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس زوایے سے اہل نظر کی ضیافت طبع کے لئے اپنے منتخب اشعار پیش کرنے کی جرأت کرر ہا ہوں۔

شاخ و ثمر سے لپٹے ہوئے ان گنت تھے سانپ
دہشت سے جیسے پیڑ میں پتّہ نہیں ہوا

دستک دیا ہے غم نے تو کچھ بات ہے ضرور
کمرے میں اسطرح تو پرایا نہ جائے گا

شاخ پھر دیوار سے اونچی ہوئی
باغ کا مالی مگر بونا ہوا

صبح اٹھا تو لگا مجھکو حسنؔ
دوسرے دن کے لئے زندہ ہوا

نام گجرات کا اگر ہم لیں
جسم پر سانپ سا گزر جائے

وہ فاتح تھا مگر جذبے سے عاری
ہماری ہار نصرت کی طرح تھی

آوازِ اضافی

اس کتاب میں جن اہم شعراء کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیک وقت سنِ رسیدگی اور پختگی کلام سے متصف ہیں۔ مزید یہ کہ ان کے کلام میں مجموعی طور پر روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا بھرپور عکس بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے بعد بھی نئی نسل کی صف میں ایسے چہرے نظر آتے ہیں جنھیں ہم بہ آسانی آوازِ اضافی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ان باقی ماندہ شعراء کی حیثیت ضمنی طور پر ٹانک دینے کی سعی کی گئی ہے ایسا اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ ان کی طبیعت کا بہاؤ موج کا روپ اختیار کرنے کو مضطرب ہے اور موج جب تک بیرونِ دریا ہے اس کی اہمیت صفر ہے۔ یہ موج چونکہ دریا میں مدغم ہونے کے درپے ہے اس لئے ان کی بقا کیلئے جتنی بھی شہادتیں دی جاسکتی ہیں۔ وہ ان کے کلام کی باطنی کیفیات کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہونگی۔

میری مراد شمیم ہاشمی، بدر عالم خلش، پرویز رحمانی، عقیل گیاوی، سہیل فصیحی، احمد نثار، شاداں منیری، مصطفےٰ مومن، احمد فرمان، امتیاز دانش، نسیم اختر نسیم، انور شمیم، احسن امام احسن، حسن رضا اطہر غیاث انجم، نازاں جمشید پوری، مشتاق احزن، فرحت حسین خوشدل، افسر کاظمی، مہتاب انور، ڈاکٹر قمر الزماں، امتیاز عزیز وغیرہم سے ہے۔ اس سے قبل کہ ان شعراء کے اوصافِ شاعری بیان کئے جائیں ان شعراء حضرات کا بھی ذکر کرتا چلوں جو صاحبِ کتاب ہو کر بھی جزو پیمبری کی معنویت سے شعوری طور پر گریزاں رہے ہیں۔ میری مراد عابد عزیزی (اوراق پریشاں)، جمال انور (مدعا) اور صبا ناوی (نگارشات) سے ہے جو شعری مجموعے کے خالقین بن کر ہمارے سامنے آچکے ہیں لیکن فی الوقت گزرگاہ ادب میں ان کا نام ونشان کہیں باقی نہیں ہے۔ ظاہر ہے منزل انہیں کو ملتی ہے جو مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔

شمیم ہاشمی : شمیم ہاشمی کا شمار جھارکھنڈ کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے ان کے ہر ایک شعر میں مطالعے کی رمق، مشاہدے کی گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ مجموعے کا نام ”ٹوٹتے پتے کا دکھ“ ہے یہ مجموعہ زوال آمادہ لمحوں کی بازگشت بن کر صدائے مضطرب کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہے شمیم ہاشمی کی شاعری کا مطالعہ زندگی کے نشیب و فراز سے

گذرنے کے حسین شعری عمل کا قرب حاصل کرنے کے مترادف ہے۔انہوں نے اپنی ذہنی کیفیات کو شعری لباس عطا کرتے وقت یہ خیال رکھا ہے کہ شہر نا پرساں میں بودو باش اختیار کرنے کا صلہ کیا ملتا ہے ذیل کا شعر اسی حسنِ سلوک کا مظہر ہے

چھلکا صداقتوں کا بدن سے اتر گیا
اچھا ہوا خلوص کا موسم گذر گیا

شمیم ہاشمی شعر کہنے سے پہلے کافی غور وفکر کرتے ہیں۔اکائی کی صورت میں کوئی خیال وجود میں آتے ہی شعر کا روپ اختیار نہیں کرتا بلکہ خود شاعر کی احتسابی نظر جب تنقیدی زاویے سے گذرتی ہے تو حروفِ خیال ترسیل کے دروازے پر دستک دینے لگتے ہیں۔اسی شعری عمل کی طرف شمیم ہاشمی نے اشارہ کیا ہے۔

کہنے کو بہت کچھ ہے مگر سوچ رہا ہوں
لب پر مرے لفظوں کی صدا ٹوٹ نہ جائے

شمیم ہاشمی کے بیشتر اشعار صلۂ رحمی کی التجا کرتے نظر آتے ہیں۔معاشرے کے ساتھ ان کا ہمدردانہ روّیہ متاثر کن ہونے کے ساتھ ساتھ دلپذیری کے معیار کو چھوتا ہے

وہ ایک لفظ سراپا ہے رات کی صورت
ہم ایک معنیٰ بے پردا ہیں سحر کی طرح
میرے حالات کی تفصیل بس اتنی سمجھو
درد کی جھیل میں گھر ڈوب رہا ہو جیسے
انگلیاں ساز پہ دھیرے ہی سے رکھنا ورنہ
گیت آہنگ کی سرحد سے گذر جائے گا

بدر عالم خلش: بدر عالم خلش شہر آہن کے منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں جدّت مستعار نہیں بلکہ طبیعت کا حصہ ہے ادب میں تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال پر ان کی گہری

نظر ہے۔ان کے لہجے کی کاٹ دور سے ہی بتا دیتی ہے کہ یہ بدر عالم خلش ہیں۔ملک کے مقتدر ادبی جرائد کے صفحات گواہ ہیں کہ بدر عالم خلش نشر و اشاعت کے معاملہ میں تساہلی کے شکار نہیں رہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر ہفتہ وار، پندرہ روزہ میں بھی ان کی تخلیقات دیکھنے کو ملیں یہ ضروری بھی نہیں۔

بدر عالم کے کلام میں براہ راست اظہار سے شعوری پرہیز کا رجحان نمایاں ہے تشبیہ واستعارے کا غیر روایتی انداز، صورت حال کی سنگینی کے خلاف احتجاجی لئے نے کلام میں ایسی کاٹ پیدا کی ہے کہ طنز کا ایک ہنر خیز معیار پیدا ہو گیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار میرے دعوے کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔

کسی گمنام جزیرے میں خدا زندہ ہے
ورنہ ہر شہر میں کیوں رسمِ دعا زندہ ہے
سیڑھیوں پر کوئی پازیب نہ چھت پر بارش
اب بھی کیوں دل میں وہ نادیدہ صدا زندہ ہے

حبیب عادل :حبیب عادل جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے ان کی غزلوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے زمانے کے تلخ مشاہدات و تجربات سے پُر اشعار قاری کو متحیر کرتے ہیں۔

دھرتی سے آملوں گا عجب آسمان ہوں
ٹوٹے ہوئے مکان کا میں سائبان ہوں
ارجن کی ہے نظر میری مچھلی کی آنکھ پر
لیکن یہ اور بات کہ ٹوٹی کمان ہوں

پرویز رحمانی :پرویز رحمانی ساتویں دہے کے اوائل میں جدید شاعری کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔مخصوص لفظیات کے استعمال، عصری حسیّت اور شعر و ادب کے تئیں ان کا مخصوص نظریہ ہوا کرتا تھا۔یہ تقریباً پندرہ برسوں سے شعری منظر نامے سے غائب ہیں۔شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے اب بھی منتظر ہیں۔پرویز رحمانی کی طبیعت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہم بہ آسانی لگا سکتے ہیں۔

خشک آنکھوں کی کہانی دشت دشت اپنی ہی تھی
نم ہواؤں میں صدائے بازگشت اپنی ہی تھی
جاگتی رہتی تھی آنکھیں خانہ خانہ خوف خوف
خواب کی روشن نمائی طشت طشت اپنی ہی تھی

عقیل گیاوی: عقیل گیاوی کا نام نئی غزل کے باب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں خیمہ بازوں کی دھما چوکڑی جہاں موجود ہو وہاں صالح طبیعت کا مالک ان تماشوں کو خموشی سے دیکھتا بھی ہے۔ اور اسے اپنا جزو شعر بھی بناتا ہے۔ عقیل گیاوی کی تخلیقات ملک اور بیرونِ ملک کے مقتدر رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر جاری وساری ہے۔ شعریت اور عقیل گیاوی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

کس درجہ اختلاف کا پودا تھا سر بلند
رہتا تھا اجنبی سا مگر گھر اسی کا تھا
باہر بھی اس کے نام کی تختی لگی ہوئی
کمرے میں بھی علامتی پیکر اسی کا تھا

مصطفٰے مومن: مصطفٰے مومن کا شعری مجموعہ ''گلاب رت'' بہت قبل منظر عام پر آچکا ہے جس زمانے میں کتاب شائع ہوئی تھی رسائل وجرائد میں بھی یہ کثیر الاشاعت شاعر کی حیثیت سے متعارف تھے۔ ادھر یہ خموش ہیں۔ شاذ ونادر ہی کوئی چیز کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصطفٰے مومن جدید رویوں کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں سماجی مطالعے کا براہ راست عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔

زرد موسم کا پرندہ تھا عجب انداز کا
شاخ سے اڑ تو گیا لیکن رہا اپنی جگہ
دھوپ پھیلی یا افق روشن ہوا لیکن جناب
اک حصارِ تیرگی موجود تھا اپنی جگہ

سہیل فصیحی: سہیل فصیحی کا شمار تازہ کار شاعروں میں ہوتا ہے۔ مترنم بحروں کا انتخاب اور پھر اسے نغمگی عطا کرنے کے بعد ان کی شاعری کا جو رنگ غزل کے کینوس پر ابھرتا ہے وہ دیرپا تاثر کو قائم رکھنے میں بے حد معاون ہے۔ ان کا کلام متعدد رسائل میں تواتر سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے کی آمد آمد ہے۔ غرض کہ غزل کے قارئین کا ایک مخصوص حلقہ مشتاق سخن ہے۔ درج ذیل اشعار سے ان کے ادبی قد و قامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قدم سے لپٹا ہوا حادثہ ہی ایسا تھا
کہ وہ سنبھل نہ سکا راستہ ہی ایسا تھا
اسے جو دیکھ لے اپنا وجود کھو بیٹھے
ترا قصور نہیں آئینہ ہی ایسا تھا

نسیم اختر نسیم: نسیم اختر نسیم کا شمار بزرگ شعراء میں ہوتا ہے۔ روایت کی حسین پاسداری اور تغزل کا اہتمام ان کی شناخت کا باعث ہے۔ ان کا کلام ملک کے اہم رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ لمس کے نام سے عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ کئی رسائل نے ان پر گوشے شائع کیے ہیں۔ درج ذیل اشعار سے ان کی شاعری کے تیور کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس سے پناہ مانگ رہی ہے شب سیاہ
جو کام کر رہا ہے اجالوں میں آدمی
موج دریا پکارتی بھی کسے
گم ہیں نام و نشاں سفینوں کے

انور شمیم: انور شمیم ہندی اور اردو بیک وقت دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ہندی میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''یہ موسم پتنگ بازی کا نہیں ہے'' بہت پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اردو شعر و ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی غزلیں بے حد خوبصورت ہوتی ہیں۔ بامعنی شعر کہنا انور شمیم کی پہچان ہے۔ کلام میں پختگی اور انداز پیشکش کی دلپذیری ان کے قد و قامت کو بلند کرتی ہیں۔

امیدیں مجھ سے اکثر پوچھتی ہیں
مرے بارے میں وہ کیا بولتا ہے
اذیت کی اندھیری زندگی میں
بغاوت کا فسانہ بولتا ہے

نازاں جمشید پوری: شہر آہن جمشید پور میں نازاں جمشید پوری کا بڑا شہرہ ہے ملک کے مخصوص سامعین ان کے کلام کے شیدائی ہیں۔ ادھر کئی برسوں سے سنجیدگی کے ساتھ رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے کلام میں دانشمندانہ تیور دیکھنے کو ملتا ہے۔ تحیّر انگیزی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کی شاعری میں حالات کی ستم ظریفی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری دیکھنے کو ملتی ہے۔

ہر قدم پر خونِ ناقص اور دشت کی فضا
کام تھا جو بھیڑیوں کا آدمی کرتے رہے
ہر موج میرے واسطے پتوار ہو گئی
ٹوٹی ہوئی تھی ناؤ مگر پار ہو گئی

شاداں منیری: شاداں منیری غزل کے شاعر کی حیثیت سے مخصوص ادبی حلقے میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ روایت و جدّت کا حسین امتزاج ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ شعر میں مضامین نظم کرتے وقت خوش سلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انھوں نے گرد و پیش کے واقعات و سانحات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ شاداں منیری کے عصری تقاضوں کی تکمیلیت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

حیرت نہیں کہ پھر کسی گجرات کی طرح
تارِ نفس کو شہر ستمگر سمیٹ لے
ہماری کوششوں میں ہی یقیناً کھوٹ تھی ورنہ
اسی بے رنگ موسم سے کئی منظر نکل آئے

مہتاب انور: مہتاب انور کا تعلق شہر آہن جمشید پور سے ہے۔ان کا شمار جدید شعراء کی اس کھیپ میں ہوتا ہے جنھوں نے جدیدیت کے پرچم کو ادب کے ہمالہ پر لہرانے کی سعی کی ہے۔ان کی شاعری کی خوش سلیقگی اور لہجے کی سادگی قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ان کا انداز پیشکش سامعین کو باندھے رکھتا ہے۔

کس سے پوچھیں سوچ میں بیٹھے ہیں ارباب چمن
موسم گل میں گل تازہ ہے کیوں بکھرا ہوا
مائل پرواز تھا کل تک صبا رفتار سا
آج اس پنچھی کا وہ جذبہ ہے کیوں بکھرا ہوا

افسر کاظمی: افسر کاظمی کا نام ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ان کی شاعری میں علم اور وجدان دونوں کی جھلک ملتی ہے۔انھوں نے عمیق مشاہدے کی بنیاد پر شاعری کا ستون کھڑا کیا ہے۔ان کی شاعری میں عصری کرب اور احتسابِ نفس دیکھنے کو ملتے ہیں۔

لرزتے ہاتھ میں پھر ساز دے رہا ہے کون
سسکی ، روح کو آواز دے رہا ہے کون
خزاں ایسی ہے ہم کو پھر وہ صحرا یاد کرتا ہے
زمینِ کربلا کا چہرہ چہرہ یاد کرتا ہے

امتیاز عزیز: امتیاز عزیز کی غزلیہ شاعری میں جدیدیت کا رنگ غالب ہے وہ اپنے گرد و پیش کی پھیلی ہوئی دنیا کو اپنی مشاہداتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ نظموں میں ان کا رنگ زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔کلام کی اشاعت پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ان کے دو شعر پیش کر رہا ہوں۔

شاخ شاخ گمشدگی برگ گل پہ حیرانی
ڈھونڈتی ہیں کیا نظریں ہر طرف ہے ویرانی
دیکھئے کس کی انا کو چوٹ لگتی ہے کہاں
ہم نے پھینکا ہے فضا میں ایک پتھر دور تک

ڈاکٹر قمر الزماں: ڈاکٹر قمر الزماں ایک فعال شخصیت کا نام ہے۔ شعر و ادب کے تئیں پرخلوص آمادگی ظاہر کرتی ہے کہ قمر الزماں زندگی کے تئیں ایک ذمہ دار شہری ہی نہیں دانشور بھی ہیں۔ سماجی مطالعے کی گہرائی کے پیش نظر ان کی شاعری میں عوامی کرب کا برملا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ ان کی نثری صلاحیت بھی اجاگر ہے خصوصاً انشائیہ سے ادب میں ان کی شناخت بنی ہے۔

ہیرے کی چمک ماند ہے اس آنکھ کے آگے
جو آنکھ زماں اشکِ ندامت سے بھری ہے
اور سب کچھ سراب ہو گویا
اک تری یاد ہی تو ہمدم ہے

غیاث انجم: غیاث انجم کی تخلیقات رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اگر یہ اپنا شعری سفر متواتر جاری رکھ سکے تو اس میں کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا کہ بہت جلد یہ اپنے لہجے کی بازیافت میں کامیاب ہو جائیں گے۔ غیاث انجم کے کلام میں سادگی و پرکاری جابجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ روایت سے تعلق اور عصری صداقت سے روبرو ہونے کا دم خم موجود ہونے کی وجہ سے شعر پرتاثیر ہوتا ہے۔

چہرے پہ نئی صبح کی تنویر نہیں ہے
آئینے کی اس میں کوئی تقصیر نہیں ہے
اندر سے تو ہیں ٹوٹے ہوئے لوگ یہاں کے
لیکن کسی چہرے پہ یہ تحریر نہیں ہے

مشتاق احزن: مشتاق احزن ادب میں نو وارد نہیں ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ لفظ احزن کا لاحقہ ان کی شاعری کا محور و مرکز ہے۔ شاعری میں حزنیہ رنگ پیش کرنا آج عام بات ہے لیکن جب اس میں وارداتِ قلبی کا مظاہرہ نہ ہو تو اثر انگیزی قائم نہیں ہو پاتی۔ مشتاق احزن کے کلام میں دیرپا تاثر قائم کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

کہاں رغبت رہی ہے آج بچوں کو کھلونوں سے
یہ وہ طبقہ ہے جواب چاقوؤں سے پیار کرتا ہے

تپش حالات کے سورج کی اس کو کیا جلائے گی

دعا ماں کی رہے سایہ فگن جب سائباں ہو کر

احسن امام احسن: احسن امام احسن اردو غزل کا ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔ شعر میں سماجی مطالعہ جھلکتا ہے۔ اپنی مخصوص طبیعت رکھنے کے باوصف شعری اظہار میں داخلی کیفیات کو ظاہر کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مترنم بحروں کا انتخاب اور خارجی و داخلی انتشار سے متصادم صورت حال کی بھرپور عکاسی ان کی غزلیہ شاعری میں ہوتی ہے۔

میں اپنا حال بتاتا بھی کس طرح تم کو

کہ لمحہ لمحہ میرے ساتھ امتحان رہا

نظر سے گزرا تھا اک بار قتل کا منظر

پھر اپنا دل بھی ہمیشہ لہو لہان رہا

احمد نثار: احمد نثار میرے ہم عصر اور بے حد فعال شاعر ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کا غزلیہ انتخاب 'والّیل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ متعدد اہم ناقدین نے احمد نثار کے کلام کو سراہا ہے۔ غزل میں ان کی مخصوص طبیعت جھلکتی ہے۔ چھوٹی بحروں میں بڑی بات کہنا نثار کا کارنامہ ہے۔ ملک کے اہم رسائل و جرائد میں متواتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے دو اشعار نقل کر رہا ہوں۔

حسینی مرتبہ کے سب ہیں خواہاں

شریک کربلا کوئی نہیں ہے

سبھی ہیں منکشف اک دوسرے پر

کسی سے بولتا کوئی نہیں ہے

حسن رضا اطہر: حسن رضا اطہر شعر و ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ درس و تدریس سے منسلک ہونے کی وجہ سے علیت کا رنگ شاعری پر حاوی ہے۔ نئی زمین کی تلاش اور اچھوتے شعر کی پیشکش کی وجہ سے قائین و سامعین بہت جلد ان کے مخاطب بن جاتے ہیں۔ حسن رضا اطہر ضلع بکارو کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

اس لئے تو کوئی حادثہ نہیں ہوتا
سفر سے پہلے وہ صدقہ نکال لیتا ہے
کچھ نہیں اک سراب تھا وہ بھی
عمر بھر جسکی جستجو میں رہا

امتیاز دانش: امتیاز دانش ندوہ جیسی عظیم درسگاہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کے کلام میں عالمانہ رنگ نمایاں ہے۔ اردو غزل کی روایت کا بھرپور ادراک رکھنے، نئی غزل کے مزاج سے آشنا ہونے کے باوصف شعر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ یہ مسلسل ذہنی کیفیت سے گزر کر شعر کہتے ہیں اس لئے شعر میں دیرپا تاثر قائم رہتا ہے۔

یہی نہیں کہ سفر دشت کا ہی تشنہ کٹا
سمندروں کو بھی پیاسا عبور کرنا ہے
ردائے خاک سب نے اوڑھ لی کیا
کسی کو حشر تک اٹھنا نہیں ہے؟

احمد فرمان: احمد فرمان سہ ماہی ''شہپر'' کے فعال مدیر ہیں۔ بحیثیت غزل گو بھی شناخت قائم ہونے کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ ملک کے اہم رسائل و جرائد میں ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے سماجی ناہمواریوں اور عوامی کرب کی اچھی عکاسی ان کی شاعری میں ہوتی ہے۔

بھیانک سا کوئی منظر نظر کے سامنے ہے
ہماری زندگی گویا بھنور کے سامنے ہے
وہ منزل تھی تمہاری تیرگی کا استعارہ
یہ منزل بھی کسی اندھے سفر کے سامنے ہے

فرحت حسین خوشدل: فرحت حسین خوشدل شاعر اور صحافی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ صحافت چونکہ عوامی مسائل کے انعکاس کا بھرپور ذریعہ ہے اسلئے شاعر کا مکروہات عہد سے متاثر ہونا فطری ہے۔ ان کی غزلوں میں سماجی ناہمواریوں کا بھرپور اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

قدم قدم پہ نئے مرحلے رہے درپیش
رکاوٹیں تھیں مگر کٹ گیا سفر اچھا
دراز ہو کے سبھی مسئلے سمٹتے گئے
نہ جانے کس کی دعاؤں کا تھا اثر اچھا

JHARKHAND KE JADEED GHAZALGO SHOARA KA TANQUIDI WA TAJZEYATI MOTALEAA

Written by

HASSAN NEZAMI

"جھارکھنڈ کے جدید غزل گو شعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ" حسن نظامی کی ایک ایسی اہم اور محنت سے لکھی گئی کتاب ہے جس کا مطالعہ جدید اردو غزل کی خصوصیات کی شناخت میں عمومی طور پر اور جھارکھنڈ کی اردو غزل کے خصائص کے حوالے سے خصوصی طور پر آئندہ کام کرنے والے محققین، اساتذہ اور اسکالرز کے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہوگا کیونکہ حسن نظامی نے اس کتاب میں جو تنقیدی اور تجزیاتی انداز تحریر اختیار کیا ہے وہ منطقی بھی ہے اور تخلیقی حس سے مملو بھی۔ "جھارکھنڈ میں جدید غزل گو شعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ" کی اہمیت وافادیت شاید اس لئے کچھ اور بڑھ گئی ہے کہ حسن نظامی خود بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں اور تخلیقی فنکار جب تنقید و تجزیہ کی سمت قدم بڑھاتا ہے تو تخلیقی حس بھی اس کی بھرپور رہنمائی کرتی ہے۔ اس پہلی باضابطہ کتاب سے پہلے بھی حسن نظامی کے مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہو کر داد و تحسین وصول کرتے رہے ہیں غزلیہ شاعری کی روایت اور موجودہ منظر نامے پر موصوف کی گہری نظر ہے۔ اور یہی گہری نظر ان کی مذکورہ کتاب کے مطالعے کا طاقتور جواز بھی ہے۔

سرود ساجد

Printed by PRINT HUT, Bhuli Road, Wasseypur, Dhanbad-9334017310